

نیرنگِ ادب کی چوتھی پیشکش

دکھوں کا سمت

سکھوں کا جزیرہ

مجموعہ کلام

شاعِلِ ادیب

ایم۔ اے

نام کتاب : دُکھوں کا سمندر
سکینوں کا جزیرہ

مصنف : شاعِل ادیب، ایم نل
اشاعت : بارِ اول

سن اشاعت : ۱۹۹۴ء (۱۴۱۵ھ)

طباعت : اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد

صفحات : (۱۲۸)

قیمت : ۴۰/۰ روپے

تعداد : (۵۰۰)

اردو اکاڈمی آنڈر اپرولش حیدرآباد کی جزوی مالی تعاون
سے شائع ہوئی۔

تقسیم کار

۱۔ آنڈر اپرولش اردو اکاڈمی۔ اے سہی کارڈز۔ حیدرآباد۔ ۴

۲۔ الیاس بک ٹریڈرس۔ شاہ علی بندہ روڈ، حیدرآباد۔ ۲

۳۔ حسامی بک ڈپو۔ پھلی کمان۔ حیدرآباد۔ ۲

۴۔ مینار بک ڈپو، گلزار حوض، چارمینار۔ حیدرآباد۔ ۲

۵۔ الکتاب، میوڑ کوشلس، گن فاونڈری، حیدرآباد۔ ۱

۶۔ انوار قمر، ۳۳۵، ساکھر پیٹھ، شولا پور۔ ۵۔ ۳۰۱۳

ناشر: نیرنگ ادب پبلیکیشنز، ۳/۹/۳۰۱۳۔ ۱۔ حیدرآباد، حیدرآباد



انتساب

میں اپنی اس تصنیف کو اپنی شریکِ حیات

نزیب شاغل ادیب

کے نام

معنون کرتا ہوں جس نے زندگی کے سفر کے ساتھ ساتھ
میرے ادبی سفر میں بھی قدم قدم پر میرا ساتھ دیا۔

شاغل ادیب، ایم۔ اے



طاہر سلیمان الطہر جاوید صاحب
صدر شعبہ اردو، ایس وی یونیورسٹی
ترنہ پتی - (لے پنی)

پیش گفزار

شاعِل ادیب عرصہ دراز سے شعر کہہ رہے ہیں۔ وہ محکمہ ٹیلیسٹریکشن آفیسر (اکونٹس) کے عہدہ پر فائز رہے اور اب وظیفہ حسنِ خدمت پر سبکدوشی کے بعد شعر و ادب کی طرف اور زیادہ مائل ہو چکے ہیں۔ موثر ادبی ہجرائد میں تو وہ ابتداء سے شائع ہوتے ہیں۔ قبل ازیں انہوں نے اپنے شعری مجموعے ”ذکر انظم۔ لغتوں کا مجموعہ“ اور ”دربارِ کرم — مناقبتوں کا مجموعہ“ بھی شائع کئے اور اب ایک بھر پور شعری مجموعہ کو نہایت اہتمام سے مرتب کر کے پیش کر رہے ہیں۔

”دکھوں کا سمندر، سکھوں کا جزیرہ“ آزاد اور پابند منظومات، غزلیات و وہیل، سانیٹ، قطعات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ شاعِل ادیب کسی ادبی تحریک یا گروہ سے ایسے وابستہ نہیں رہے لیکن صحت مند مثبت اور انسان دوست شعری و ادبی میلانات ان کے یہاں ملتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے بھی ان کے یہاں ایک نوع کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ خصوصاً ترقی پسندی کے ابتدائی دور میں، اس تحریک کے شاعروں کے یہاں رومانیت کا جو غلبہ رہا، شاعِل ادیب کے کلام میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ کہیں کہیں تو ان کے یہاں رومانیت کا رنگ گہرا اور از ابتداء



آنکھوں کے آگے دکھ کا سمندر تو ہے سدا
یارب کبھی تو سکھ کا جزیرہ دکھائی دے

شاغل ادیب



تسا آخر موجود ہے اور بیشتر نظموں میں غم جہاں کا تذکرہ کرتے ہوئے کم یا زیادہ ،
 بین السطور میں یا حوالہ کے طور پر ”ہم نشیں“ ”آجا میری ترہ آجا“ ”اور سپنوں کے خوں“
 جیسی منظومات میں غم ذات اور غم حیات کی ان کیفیات کا اظہار ہوتا ہے ۔
 شاعر ادیب نے صرف اپنے جذبات اور محسوسات کی ترجمانی نہیں کی ہے ۔
 انہوں نے اپنی آنکھیں بھی کھلی رکھی ہیں ۔ مطالعہ و مشاہدہ بھی کیا ہے ۔ غور و فکر سے
 بھی کام لیا ہے ۔ اور پھر ان سب کے حاصل کو شعری لباس پہنایا ہے ۔ افراد کی جی
 زمانے کے تغافل ، اخلاقی اور روحانی قدروں کے زوال ، رشتوں ، ناطوں کی بے معنویت
 عدم اعتمادی ، اس دور کی لایعنی کیفیات ، انتشار ، بحران ، غیر یقینی اور ہر سمت ایک
 ویرانی ہی ویرانی سی ، — ان سب کو شاعر ادیب نے اپنی شعری گرفت میں
 لینے کی سعی کی ہے ۔ اور کہیں کہیں بہت اچھے انداز میں ۔ ”خالی مکان“ اور ”چادر“
 ایسی ہی نظمیں ہیں ۔ ”خالی مکان“ کے یہ مصرعے

در بے صدا ہیں

ہر اک سمت چھایا ہے ستا گہرا

مجسم خموشی

سرایا اداسی

یہ ستا گہرا

یہ خالی مکاں ہے

کہ اجڑا کوئی دل

”کوئی“ بھی اچھی نظم ہے جس میں انہوں نے درون کی کیفیت کو پیش کیا ہے
 شاعر ادیب نے حمد ، نعت ، منقبت ، سلام اور مرثیے بھی لکھے ہیں ۔

علاوہ ازیں ادبی، قومی اور سیاسی شخصیتوں پر بھی ان کی کئی منظومات ہیں۔ ایسی قابل ذکر شخصیتوں میں جگر مراد آبادی، خورشید احمد بجائی، ڈاکٹر حسینی شاہد، جواہر لعل نہرو، گاندھی جی، ڈاکٹر زور، اور لال بہادر شاستری شامل ہیں۔ بعض اشعار میں انہوں نے نہایت موثر انداز میں اپنے جذبات کی عکاسی کی ہے۔ بطور مثال جواہر لعل نہرو کی وفات پر ان کی نظم ”تیرگی کا زہر“ کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

ہے روح روحِ فسرده، بدن بدنِ مردہ
ہر ایک ذہن پریشان ہے، چشم ہے پر غم
آداس آداس ہے گنگا، آداس ہے جمنا
اک ایک نقشِ اجنّا ہے سر بسر.... ماتم
گلاب آج ہے کشمیر کا بجھا ہر اک
ہے آج تاج کے رخ پر بھی بیوگی کا.... غم

قومی یکجہتی کے موضوعات پر بھی شاعری ادیب کی نظمیں اچھی ہیں ”نئے سال کا عہد“ سے سال کا تحفہ بھی ہے اور قومی یکجہتی کے سلسلے میں ایک شاعر کا حصہ بھی۔ میں یہاں اصناف سے قطع نظر کرتے ہوئے شاعری ادیب کی رباعیوں کا تذکرہ کر رہا ہوں۔ اس مجموعہ میں شاعری ادیب نے کچھ ایسی زیادہ رباعیات شامل نہیں کی ہیں۔ لیکن رباعی کے جو فنی، ادبی اور معاشرتی تقاضے ہوتے ہیں ان کی تکمیل ان رباعیوں میں بڑی حد تک ہو جاتی ہے۔ ان میں فن کا احترام بھی ہے۔ درس اخلاق بھی اور اثر آفرینی بھی۔ یہ دو رباعیاں قاری کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لیں گی۔

ہر زخم ہے سینے کا ابھرنے والا
ہر درد ہے اب دل سے گزرنے والا

ہر سمت دیئے غم کے جہلائیں آؤ
انسان کا مقدر ہے سنورنے والا

اے رفعتِ تہذیب تجھے دیکھ لیا
اے اوجِ تمدن تجھے ہم نے پرکھا
ہے یہ بھی اک اندازِ ترقی شائد
انساں ہی کی نظروں سے ہے انسان گرا

شاغلِ ادیبِ نظم اور غزل دونوں پر یکساں قابو رکھتے ہیں۔ ان کی غزل پر روایت کا اثر ہے لیکن ادھر راجِ صدی میں غزل نے جو نئی کردِ ملی ہے ان کی غزلوں میں اس کی جھلک بھی مل جاتی ہے۔ روانیت تو ان کی شاعری کا مجموعی عنصر ہے ہی۔ غزلوں میں بھی ان کی کار فرمائی ہے۔ چنانچہ اس نوعیت کے اشعار ان کی غزلوں میں مل جاتے ہیں۔

کل رات ہم کو نیند نہ آئی بجا مگر
کل شب رہے ہیں وہ بھی بہت بقیار سے

لیکن ان کی غزلوں سے ایسے اشعار بھی پیش کئے جاسکتے ہیں جن سے ان کی بھرپور عصری حیثیت کا اظہار ہوتا ہے۔ انہوں نے زندگی کی تلخیوں، کرب و بلا اور ساخت و حادثات کو نہایت عمدگی کے ساتھ غزلوں میں سمو دیا ہے۔ بعض شاعروں کے ہاں غم جہاں کے بیان سے غزل روکھی پھسکی بے رنگ اور سپاٹ ہو جاتی ہے۔ شاغلِ ادیب نے غزل کے مزاج کو برقرار رکھا ہے اور مسائلِ حیات کو پیش کرتے ہوئے تغزل سے بھی کنارہ کشی اختیار نہیں کی۔ یہ چند اشعار دیکھئے۔

صبح کھا جاتی ہے اور شام نکلتی ہے انہیں
وقت کے ماروں کو سکھ چین کہاں ہوتا ہے

شافل ادیب! مجھ سے بھی میل کے رو پڑے
پیکر پول ان دنوں میں کئی حادثات کا

دردِ جہانِ عشق، غمِ تلخی، حیات
تیرے نثار! اب کسی غم کی کمی نہیں

دل تشنہ، ہونٹ خشک، امیدیں ہیں ریت ریت
یہ زلیلت ہم کو دوستو.... صحراد کھائی دے

قومی ترقیات کے بارے میں عوام کو خوش فہمیوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا
کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ہمارے سیاسی قائدین کے بلند بانگ دعوے، گھن گرج
لئے ہوئے بیانات، چمکتی دھمکتی تقاریر اور کھوکھلے نعرے.... ان سب کو ذہن میں
رکھتے ہوئے شافل ادیب کا یہ شعر پڑھیے۔

ہر لب پہ جگہ لگاتے ہیں سورج کے تذکرے
یہ اور بات ہے کہ کہیں روشنی نہیں

اس دور میں نئے نئے علوم، سائنسی ایجادات اور صنعتی ترقیات کے باوصف
فرد کی بے بسی کی ہمارے بیشتر شاعروں نے ترجمانی کی ہے۔
شافل ادیب بھی کہتے ہیں۔

جس کا اب تک جواب بن نہ پڑا
ایک ایسا سوال ہیں ہم لوگ
دکھ جھپٹتے ہیں ہم پہ یوں جیسے
اک غنیمت کا مال ہیں ہم لوگ

شاعِل ادیب اس کے باوجود زندگی اور حالات سے مایوس نہیں - وہ
رجائیت پسند ہیں اور انہیں یقین ہے کہ آنے والا کل روشن ہوگا۔ آج حالات کیسے
ہی ناگفتہ ہوں کل اجالے ہوں گے۔ تہذیب کا سویرا جلد آئے گا۔
چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

میں گے ٹوٹ کے مجھ سے اجالے دیکھو گے
مجھے گپھاؤں سے باہر نکال کر دیکھو

شاعِل ادیب! ہم نے چھوڑا ہے شب کو بیچھے

اپنے سفر کی منزل، تہذیب کا سویرا

شاعِل ادیب نے اپنی شاعری کو عام طور پر بوجھل بے رنگ و بے کیف
ہونے نہیں دیا۔ تشبیہات وغیرہ کا استعمال ان کے یہاں ہے۔ لیکن صنعت گری
کے بلاوجہ استعمال سے انہوں نے اشعار کو گراں بار نہیں کیا ہے۔ کیونکہ انہیں اندازہ
ہے کہ شعری سفر میں کیا ہوا شاعِل نہ پوچھتے
صنعت گری کی دھن میں غزل ہو گئی سپاٹ

صنعت گری سے شاعِل ادیب نے کام نہ لیا ہو۔ مگر پھر بھی وہ اس کی دھن
میں اپنے آپ کو نئی غزل کے منفی عناصر سے بچا ہی رکھیں تو ان کی شاعری کا رنگ

یقیناً اور گھرے گا کیونکہ ان کے مجموعہ میں ایسے خوبصورت اشعار بھی ہیں۔

شب نہ ٹپکنے ستارے نہ سہی، صبح کی گود
میرے اشکوں کے ستاروں سے تو بھر جائے گی

موت ہوئی گھر چھوڑے ہوئے مجھ کو مگر آج
کیا جانے کیوں دل سے جدا گھر نہیں ہوتا

مجھے یقین ہے شاعری ادیب کا شعری سفر نئی منزلوں کی سمت گامزن رہے گا
اور ان کے اس مجموعہ ”دکھوں کا سمندر“ سکھوں کا جزیرہ“ کی ادبی حلقوں میں مناسب
پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

ایم، اے۔ پی ایچ ڈی

صدر شعبہ اردو

ایس وی یونیورسٹی، تروپتی



ڈاکٹر طیب انصاری صاحب
صدر شعبہ اردو، فارسی و عربی
گورنمنٹ کالج، علی گڑھ (دکن ہندوستان)

شاعری شاعری

میسری نظر میں

شاعری ادیب ادیب صاحب اردو کے کہنے مشق شعراء میں سے ہیں۔ ان کی مشق سخن ایک طویل عرصہ پر محیط ہے۔ اردو کے بیشتر رسائل میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ اور ان کے پڑھنے اور جاننے والوں کی بھی خاصی تعداد موجود ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کسی بھی رسمی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔

شاعری ادیب صاحب قبل ازیں دو مقدس اور متبرک نعتوں اور منقبتوں کے مجموعے ”ذکرِ اعظم“ اور ”دربارِ کرم“ علمی، ادبی اور مذہبی حلقوں میں پیش کر چکے ہیں، دارِ سخن کے ساتھ ”آبِ دارین“ کے بھی مستحق ہیں۔ صالح اور صحت مند ادب کی یہی افادہ ہے کہ اس کی وجہ سے مقبولیت حاصل ہوتی ہے وہیں اس کا اجرِ نیک بھی ملتا ہے۔ اب جو نیا شعری مجموعہ ”دکھوں کا مہمند، سکھوں کا جزیرہ“ منظرِ عام پر آ رہا ہے تو میں بلا تامل کہوں گا کہ اس مجموعہ شعری کے بعد انہی ”مقبولیت“ اور قبولیت میں انشاء اللہ اضافہ ہی ہوگا۔

اچھا شعر میرے نزدیک وہی ہے جو ظاہری اعتبار سے حسین اور خوبصورت ہے اور باطنی طور پر روح پرور اور قلب کو گرمانے والا۔ افلاطون نے غالباً یہی بات

اپنے انداز میں کہی تھی کہ حسن بھی بذاتِ خود ایک قدر ہے۔ صداقت، خیر، رحم، عدل و انصاف حسن ہی کے مترادفات ہیں۔ حسن کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ حسنِ ذات اور حسنِ صفات دونوں کا مجموعہ ہو۔

اکثر حسن کی تلاش ظاہر میں کی جاتی ہے۔ چنانچہ ادب میں بھی زبان، ہیئت اور اسلوب کو حسن کا معیار قرار دیا گیا۔ بعضوں نے معنی میں حسن کی تلاش کی ہے۔ دونوں ہی کا منشا شہ پارے میں حسن کی جلوہ گری ہے۔ ظاہری حسن کے اس تصور نے نرے ادب کی تخلیق کی ہے۔ ابتذال اور غریانیت نے جگہ پائی اور محققِ حظ کا حصول منسلکِ شعری قرار پایا۔ حالانکہ اس طرح کا حظ بازارِ حسن کی سیر سے بھی حاصل ہو سکتا ہے یا کسی مجرب کی محفل میں شرکت سے بھی۔ اس طرح کے حصولِ حظ کے لئے شعری رسوائی کیوں مقصود ٹھہری۔ جس طرح افادی / مقصدی ادب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ادب واعط نہیں ہے۔ جو اباً عرض ہے کہ ادب رقاصہ کے پاؤں کا گھنگرو بھی تو نہیں ہے۔ ادب اسی وقت با ادب ہوگا جو ظاہری اور معنوی اعتبار سے حسین ہو۔ بلاشبہ ارسطو نے شعر میں حظ کے پہلو پر زور دیا ہے لیکن اگر کوئی فواش، ابتذال، غریانیت اور اسی طرح کے مکرہات ہی کے ذریعہ حظ اٹھانا چاہتا ہے تو ظاہر ہے وہ نفسیاتی طور پر مرتضیٰ ہے۔ اور اس طرح کے حظ میں پائیداری بھی نہیں ہے۔ یہ اندازِ فکر نہ صرف منفی ہے بلکہ مضرت رساں بھی ہے۔ یہ بات میرے لئے باعثِ طمانیت بھی ہے اور باعثِ مسرت بھی کہ شاعری ادیب صاحب کے یہاں حسن کا منہمک ثابت، پاکیزہ اور تعمیری ہے۔ لفظ و بیان کا حسن بھی اس مجموعہ شعر میں آپ کو ملے گا اور معنی و مفہوم کا حسن بھی۔ اس کی بنیادی وجہ وہ ستمناور اور پاکیزہ ماحول ہے جس میں ادیب صاحب کی ذہنی اور شعری تربیت ہوئی ہے۔ میری بات کے ثبوت

میں عرض ہو کہ انہوں نے ”ذکرِ عظم“ سے اپنے شعری سفر کا آغاز کیا ہے۔ ”ذکرِ عظم“ اور ”دیارِ کرم“ ان کے ایسے شعری مجموعے ہیں جن کا مطالعہ با وضو ہونا چاہیئے۔ اب زیرِ نظر مجموعہ ”کلام“ دکھوں کا سمندر سکھوں کا جزیرہ“ بھی جوان کی نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے، افکار کے لحاظ سے ذہین انسانی میں زندگی کا پاکیزہ تصور ابھارتا ہے۔ شاعر ادیب صاحب کے اس مجموعہ ”کلام“ کا آغاز بھی حمد شریف ہے۔ نعت کے علاوہ منقبت بھی شامل ہے۔ یہ آغاز محض روایتی نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ بلکہ ادیب چونکہ نسبت خاص بھی رکھتے ہیں اس لئے وہ پورے خشوع و خضوع کے ساتھ ذاتِ باری تعالیٰ کے آگے سر بہ سجود ہیں۔ خیال و فکر کی یہ پاکیزگی شروع سے آخر تک ملے گی۔ چاہے وہ رباعی کہہ رہے ہوں یا قطعہ یا پھر غزل۔ چند اشعار غزل ہی سے پیشِ خدمت ہیں۔

ہیں جہاں طاری ظلمتیں شاعِل
ہم و ہیں روشنی کی بات کریں

ٹبرہ لگے کچھ اور شاعِل، جانبِ زنداں جو ہم
تقویت کچھ اور دل کے حوصلے پاتے رہے

ہم سحر کے دیوانے، جس طرف کو چلتے ہیں
ہر قدم نہ وانجم، یادیں پر مچلتے ہیں

تمام رات رہی سر پہ دھوپ ہی شاعِل
مرے وجود پہ سورج یہ کون اچھا لگیا

زندگی میں ہر رہ پر پیچ سے گزرے ہیں ہم
کوئی بھی مشکل نہیں ہے ہم کو مشکل آج کل
انداز کا تیکھا پن ملاحظہ کیجئے

جسم خالی ہے جان ہے خالی
زندگی کا مکان ہے خالی

جلی گئے یوں تو ہم سمندر بھی
شاعری اپنی بھی نہ لیکن پیاس

شاعری اصل میں ہے کوہِ گمنی

پھر بھی ہم کو یہ لفظ پیسا رہے

شاعری صاحب کے یہاں فکر و خیال کا یہ تنوع اور پاکیزگی اصل میں ان کے
شعری خوبی ہے۔ اور یہی خوبی ان کے اشعار کو زندہ و تابندہ رکھے گی۔ ویسے تعلی
ہر شاعر کا شیوہ رہی ہے لیکن شاعری ادیب صاحب کے یہاں یہ دعویٰ محض نہیں
ہے۔ وہ ایسا کہتے ہیں حق بجانب ہیں۔

یہ تعلی نہیں ہے سچ شاعری

شاعر با کمال ہیں ہم لوگ

شاعری ادیب نے اپنے اس مجموعہ کا نام "دکھوں کا سمندر سکھوں کا جزیرہ"
تجویز کیا ہے۔ لگتا ہے زمانے نے انہیں دکھ زیادہ اور سکھ کم دیا ہے۔ ان کی
شاعری میں مجھے زندگی کا اثبات نظر آیا۔ یہ ان کی حوصلہ مندی کا احساس

دلاتا ہے۔ شک کے لئے دُکھ سے بڑنا اور دُکھ پر فتح پانا انسان کا مقدر ہے۔
 لیکن اس کے لئے عزم و حوصلہ کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں شاعری ادیب کے
 ساتھ ساتھ ہمارے دوسرے شعراء بھی حالی، شبلی، اور اقبال کی طرح حیات
 سے زور آزمائی کا حوصلہ پیدا کریں تو فتح دور رہیں۔

پنھاؤ ہوگی انساں تجھ پہ رفعت دونوں عالم کی
 اگر اونچا تری گفتار کا معیار ہو جائے

ڈاکٹر طیب انصاری
 صدر شعبہ اردو، علامہ اقبال یونیورسٹی، لاہور
 گورنمنٹ کالج، گلبرگ
 (کراچی)

۱۱۶۔ ڈی، ایوان شاہی
 گلبرگ (کراچی) 585102





لوح و قلم

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

فیض احمد فیض





کَمَد ○
 نَحَسَت ○
 مَنَقِبَت ○
 سَلَام ○
 مَرِثَیَ ○
 دُونِیَ ○ اور
 نَظِہِیَ ○



مَکد

منجھار میں انساں کو، تو ہی تو تراتا ہے
ہر ڈوبنے والے کو، مولا تو بچاتا ہے

رحمت کا تری آقا، محتاج ہے ہر کوئی
شاہوں کو غلاموں کو، تیرا ہی سہارا ہے

تو آگ جہنم کی، برساتا ہے منکر پر
مخروء کی آتش کو، گلشن بھی بناتا ہے

ہر چیز کا ہے خالق ہے سب کا محافظ تو
تو پیٹ میں پھلی کے، یونس کو جلاتا ہے

بدکار بچیں گے کیا، وہ ڈوب ہی جائیں گے
تو نوح کی کشتی کو، طوفاں میں تراتا ہے

تنبیہ بھی کرتا ہے ، مجرم کو بھی جرموں پر
عاصی کو تو ہی یارب ، سینے سے لگاتا ہے

غزٹ ملے ہے تجھ سے ، دیتا ہے تو ہی ذلت
جھوٹے کو گرائے تو ، سچوں کو اٹھاتا ہے

مرعی بنالے آقا ، پتہ بھی نہ مل پائے
چاہے تو اگر پل میں ، دنیا کو ہلاتا ہے

کیا حمد لکھے تیری ، یہ شاغلِ عاصی بھی
ہے تیرا کرم اُس پر ، تو ہی تو لکھاتا ہے

نَحْتِ

دنیا کو سبق دیتا ہے کردارِ مُحَمَّد
بے غیب ہیں بے مثل ہیں اطوارِ مُحَمَّد

خالی نہ گئی کوئی طلب کوئی تمت
سرچشمہ الطاف ہے سرکارِ مُحَمَّد

مالوس نہ لوٹا کوئی اک فرد یہاں سے
دربار ہے داتا کا وہ دربارِ مُحَمَّد

سنسار میں کیا خاک سکوں اس کو ملے گا
ترپے گا شب و روز گنہ گارِ مُحَمَّد

بیماروں نے ہر وقت شفا پائی ہے اس سے
دنیا کا سینھا ہوا... بیمارِ مُحَمَّد

آرام ہمیشہ رہا تقدیر میں اس کی
بے فکر ہمیشہ رہا سرشارِ محمدؐ

سیراب کبھی تو نگہِ شوق ہو میری
یارب! کبھی تو ہو مجھے دیدارِ محمدؐ

ہیں بیچ سبھی جن و بشر آپ کے آگے
اعلیٰ ہے بہت اونچا ہے معیارِ محمدؐ

ہے حُبِ نبیؐ حُبِ خدا اصل میں شاعِل
اس بات سے واقف ہے پرستارِ محمدؐ



منقبت

حضرت شیخ علاؤ الدین انصاریؒ عرف حضرت لاڈلے مشائخ
 ————— النذ شریف —————

اس منقبت کے بیشتر بند ڈاکٹر طیب انصاری صاحب کی تصنیف
 "مخدم علاؤ الدین انصاریؒ" پر مبنی ہیں۔ (رشتہ ۱۰)
 دربار ہے نہ الا ترا شیخ لاڈلےؒ
 پاتے ہیں فیض تجھ سے دوانے بھی ترے

اخلاص کا نمونہ ترا مستقر النذ
 ہے پیار کا اخلاصؒ پیغامبر النذ
 ہر قوم کے لئے ہے عقیدت کا گھر النذ

در تیرا ہے کھلا ہوا ہر فرد کے لئے
 دربار ہے نہ الا ترا شیخ لاڈلےؒ

چو کھٹ پہ تیری آج جھکا ہے ہر ایک سر
 ہو کیوں نہ احترام ترا، تو ہے معتبر
 دنیا تری دوانی ہے العقہ مخقر

قربان سب ہیں تیری حبس بارگاہ کے
دربار ہے نرالا ترا شیخ لاڈلےؔ

تعمیل حکم پیر میں تو آیا تھا یہاں
تبلیغ دین حق میں لگا دی تھی تو نے جاں
مخدوم تیرے درس کے تھے سب ہی قدرداں

تو ایک تھا مگر ترے شیدا ہزار تھے
دربار ہے نرالا ترا شیخ لاڈلےؔ

تولیدِ قدس تیری کرامت ہی تھی شہاؔ
ترط کے پہ نور کے گئی ماں تیری بوکھلا
آئی معاً صدا کہ گھراب پیسہ آگیا

جو ہر تری بزرگی کے پھر سب پہ کھل گئے
دربار ہے نرالا ترا شیخ لاڈلےؔ

رسیا نہیں تھا صرف تُو قدرت کے نور کا
دوشیزہ دکن پہ ترا دل بھی آگیا
بعد نماز جس کا نظارہ کیا سدا

روشن حجاز میں تھے حقیقت کے تمقمے
دربار ہے نہ الا ترا شیخ لا ڈلے

روشن منیر، صاحبِ دل، صاحبِ نظر
توصیف تیری کر نہیں سکتا کوئی بشر
تو تھا خلیفہ پھر بھی ہوا پیرِ باہنر

دیکھے ہیں اپنے عہد میں انوارِ خضر کے
دربار ہے نہ الا ترا شیخ لا ڈلے

گمانِ منزل

چھٹ گیا رنج و غم کا اندھیا
 دیپِ آشا کے ہو گئے روشن
 سائے میں پرچمِ مسرت کے
 جھوم کر گیت گا اٹھا جیون

حوصلے ہیں جوان اور ہمت
 سکراتی ہے گنگنا تی ہے
 "بار" کے بدلے بدلے ہیں یہ
 "جیت" ہنس ہنس کے بڑھتی جاتی ہے

کرنہ اب دیر، ساتھی اٹھا اب اٹھ
 پایہ جولاں "نیا زمانہ" ہے
 روشنی "صبحِ نو" کی پھیلی ہے
 لب پہ رقصال "نیا ترانہ" ہے

ہاں! یہی آج کہہ رہا ہے دل
 بڑھ چلو، دور اب نہیں منزل

تلاش سکوں

نہ پایا سکوں قلبِ مضطرب نے میرے

جواں سال رنگیں بہاروں میں دیکھا
حسین اور دلکش نظمِ رواں میں دیکھا
چمکتے ہوئے چاند تاروں میں دیکھا

نہ پایا سکوں قلبِ مضطرب نے میرے

سرور و خوشی کے فسانوں میں ڈھونڈا
حظ و عیش کی داستانوں میں ڈھونڈا
عناد کے شیریں ترانوں میں ڈھونڈا

نہ پایا سکوں قلبِ مضطرب نے میرے

مہکتی ہوئی کالوں سی فضا میں
گلستاں کی بدست چنچل ہوا میں
پیپے کی دلکش رسیلی صدا میں

نہ پایا سکوں قلبِ مضطرب نے میرے

مساجد میں گرجاؤں میں بتکدوں میں
یہ مستی نظر کیف زامیکدوں میں
طرب گاہوں میں اور عشرتکدوں میں

نہ پایا سکوں قلبِ مضطرب نے میرے

آج کا کوی

مرے ساتھیو! آج کا ہوں کوی میں
مجھے مالداروں سے ہے سخت نفرت
محبت ہے بے حد مجھے جھونپڑوں سے
مجھے محلوں سے ہے نہایت کراہت

سخن میں مرے کچھ ارادے ہیں ایسے
تو بدلیں گے سرمائے کا نظم اک دن
مرے گیتوں میں ہیں کچھ انکارے ایسے
جو پھونکیں گے سرمائے کی بزم اک دن

کوی ہوں کوی بے کسوں کا سہارا
مجھے ان کی حساطر ہے مرنا گوارا

تم سلامت رہو

پیشہ پہلے پتے شیخ منیر الدین کی پہلی سالگرہ پر

گیت ہونٹوں پہ سو محپل اُٹھے
زندگی مسکرا کے جھوم اٹھ
سینے میں سٹو چراغ جل اُٹھے
چھٹ گئی رنج و غم کی تاریکی

آج ہر گام پر مسرت ہے
منتریں زمزمے سناتی ہیں
روح رقصاں، نفس نفس شاداں
دھڑکنیں جھوم جھوم جاتی ہیں

حالتِ زیب آج کیا کھیے
خندہ گل سجا ہے ہونٹوں پر
رُخ پہ ہے اک، جھوم شادابی
حور سی ڈولتی ہے رہ رہ کر

نورِ سیدی شریک حیات

اور دادی کی بوڑھی آنکھوں میں
 رقصاں انوار و صفوں کا اک عالم
 گود میں ہے منیر اور لب پر
 سوزِ دعائیں مچلتی ہیں ہر دم

گنگنائی ہے اب یہی دھرتی
 اور گالتے ہیں اب یہی ستارے
 "تم سلامت رہو مزارِ برسس
 ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار"

۲۷ مسیری دادی جان

چاند

اے حسین چاند ! اے آسماں کے صنم
 ہے خبر کچھ تجھے
 کتنا آباد تھا سو مناتِ جنوں
 آرزو سے تری
 اک ترے پیار سے

اے حسین چاند ! اے آسماں کے صنم
 تجھ کو معلوم کیا
 کتنی شدت سے پوجا تھا میں نے تجھے
 سالہا سال سے
 صدیوں سے ان گنت

لے تیں چاند ! لے آسماں کے صنم
 ہے تجھے کچھ پتہ
 آج ہوں میں تری
 بزم میں جلوہ گر
 ہوں جنوں ابتدا ، بندگی انتہا

لے مرے چاند ! لے آسماں کے صنم
 یہ مگر کیا ہوا
 تو کہ خاموش ہے ، سرد و ساکت ہے تو
 جیسے پروا تھے اب نہیں ہے کوئی
 پیار کی
 بندگی کی مری

لے حسیں چاند ! لے آسماں کے صنم
 بول کچھ تو ذرا
 تو بھی شاید زمیں کا ہی اک چاند ہے
 خود غرض ، خود نما
 بے حس و بے وفا

سپینوں کا نگر ہے کہ یہ شمشان ہے بابا
ہر گام پہ جلتا ہوا انسان ہے بابا

لا حول پڑھیں کس پہ دعائیں دیں کسے ہم
اس دور کا انسان بھی شیطان ہے بابا

آرام کڑی دھوپ میں ہے مجھ کو مگر وہ
بادل کی گھٹی پچھاؤں میں حیران ہے بابا

جب بات وہ کرتا ہے تو لگتا ہے فلاطون
یوں دیکھتے ہیں وہ بڑا نادان ہے بابا

جس رشتے کی تقدیس پہ قربان ہے سناہ
اُس رشتے سے افسوس وہ انجان ہے بابا

شاعِل کا ادب میں بھی بڑا نام ہوا ہے
شاعِل یہ بہت آپ کا احسان ہے بابا



خوشیاں جیسے ساتھ جیون کا سرا دیتی نہیں
دستِ غم سے ویسے ہی چھٹ جلتے گا دامنِ ترا

ہونہ معنوم و پریشاں، یوں ہی اُٹھ اب ہم نشیں
اُٹھ نہ کر تو دیر اب، اٹھ مکر اور گیت کا

دیکھ اب ڈھلنے لگی شب کی بھیانک تیرگی
دیکھ صبح کیف زا ہونے لگی اب آشکار



نذرِ جگر

شہنشاہِ تغزل حضرت جگر مراد آبادی کی وفات پر



خموش و سر بہ گریباں ہیں اہلِ بزمِ جہاں
اک ایک اٹھتا چلا جا رہا ہے چپ کے سے
اجل کہ بڑھتی ہی جاتی ہے بائیں پھیلائے
دلِ حیات کہ رہ رہ کے بیٹھ جاتا ہے

فغاں بہ لب ہے سخن اور ادب ہے افسردہ
غزل کی آنکھ سے بہتا ہے خون کا دریا
اداس اداس ہے فن اور بجھا بجھا ہے ہنر
ربابِ شعر سے اب پھوٹ نہتے ہیں نونے

ہیں ذہن و فکر و نظر آج شاغلِ ماتم
دل و جگر نے بھی دم توڑ ہی دیا تھک کے

ضیائے ”شعلہ طور“ اور نہ ”آتشِ گل“ اب
جہاں سے اٹھ گئی زنجبیل و تغزل اب

غضب کہ جاتا رہا اب جگر امیرِ فن
ستم کہ چھین گیا ہم سے امامِ فکر و سخن



آجا میری زہرہ آجا

آجا میری زہرہ آجا
 زلیت کا مجھ کو راز بتا جا
 پاؤں تھک کے رک جاتے ہیں
 مجھ کو منزل پر پہنچا جا
 آجا میری زہرہ آجا
 چشمِ دل خوں بار ہے تجھ بن
 جیون اک آزار ہے... تجھ بن
 آزار و غم کے سینے... پر
 پیچم راحت کا لہرا... جا
 آجا میری زہرہ آجا
 پوچھ نہ مایوسی کا عالم
 ہر سو خاموشی کا... عالم
 تجھ بن ساکت سارا جل تھل
 آجا ہلچل ایک مچا جا
 آجا میری زہرہ آجا

تیرہ تیرہ آس کی دنیا
 سرد و نموش احساس کی دنیا
 تجھ بن مردہ دھڑکن دھڑکن
 سینے میں شعلے بھڑکا جا
 آجا میری زہرہ آجا
 بچپن کے وہ سینے سارے
 سندر سندر پیارے پیارے
 نقش ہیں جن کے دل پر اب بھی
 آجا کر لیں پورے آجا
 آجا میری زہرہ آجا
 اپنے ساتھی اپنے دشمن
 لوٹ چکے اب سارے بندھن
 جیون بھی تجھ بن بیگانہ
 آجا دستِ شوق بڑھا جا
 آجا میری زہرہ آجا

آجیا دنیا ایک بسائیئیں
پریت کے اس میں چاند کھلائیئیں

بن جبا ئیں ہم جیون ساتھی
دل سے دل کو راہ سمجھائیئیں

اور یہ سماجی طوق و ساسل
گرم و جواں خوں سے پگھلائیئیں
اور یہ حد کے سڑے گلے میں
کھولیں پیار کا امرت آجیا

آجیا میری زہرہ آجیا
آجیا میری زہرہ آجیا



تیرگی کا زہر

پنڈت جواہر لال ہنرد کی وفاتِ حسرت آیا ہے۔



نشاطِ زلیست کی پُتر نور شاہراہوں میں
اجل کی تیرگی کا زہر کیسے پھیل گیا
اداسی لٹنی یہ کس قدر شہرِ دل پر.... آج
یہ کیسے آج بجھا آفتاب بھارت کا

ہے روح روح فسدہ ' بدن بدن مردہ
ہر ایک ذہن پریشاں ہے ' چشم ہے پرِ غم
اداس اداس ہے گنگا، اداس ہے جھٹنا
اک ایک نقشِ اجنما ہے سرسیرِ ماتم
گلاب آج ہے کشمیر کا بجھا ہر اک
ہے آج تاج کے رخ پر بھی بیوگی کا.... غم

یہ یک بیک خضر امن اکھٹا گیا کیسے؟
یہ کیا ہوا کہ ہیمبرِ خلوص کا..... روٹھا
یہ کیا ہوا کہ گیا اب جواہرِ اعظم
یہ کیا کہ مر گیا آج اک غظیم راہنما



خالی مکاں

مجسم خموشی
سراپا اداسی
چھتیس ہیں بجھی سی
فسردہ فسرده ہے دیوار ہر اک

درتچے ہیں خاموش
دربے صدائیں
ہر اک سمت چھایا ہے سناٹا گہرا

مجسم خموشی
سراپا اداسی
یہ خالی مکاں ہے
کہ اجڑا کوئی دل

عقیدت کے پھول

بزمِ جیونِ حیدر آباد کے زیرِ اہتمام منعقدہ حضرت نور شید احمد جامی
کی خیر مقدمی تقریب میں پڑھی گئی۔ (ش۔ ۱)

سلام! جامی فنکارِ شاعرِ اعظم
ترے حضورِ عقیدت کے پھول لائے.. ہم
کہیے کیا ترے فن کی کلام کی عظمت
کہاں یہ ہم کہاں تیرے مقام کی عظمت

چمن چمن ترے نغمے بہ محفلِ اردو
کمالِ فن کی ترے ہے نفسِ نفسِ نوشبو

ہنر کے شہر میں تو نے اگلے چاند نئے
دیباہِ فکر میں تو نے سجائے چاند نئے

ہے نظم نظم تری شعرو فن کا آئینہ
غزل غزل ہے تری یا صنم ہے آزرہ کا

بڑھی کچھ اور تری شہرتِ ادب جامی
بڑھایا تو نے قدِ عظمتِ ادب جامی

سپنوں کے نول

آج غم خانہ زندگی میں پھر
جل اٹھے تیری یادوں کے بجھتے چراغ
رقص کرنے لگی بزم شوق و جنوں
پھر کھنک اٹھے احساسِ دل کے ایاغ

میں رہ جستجو میں بھٹکتا ہوا
یک بیک شہر میں آگیا تھا ترے
پاؤں تھک سے گئے شوق رک سا گیا
اٹھیں نظریں تو پایا سنا تجھے سامنے

دل نے تھپکی دی آہستہ اور یہ کہا
”مل گئی تجھ کو منزل تری مل گئی“
نول سپنوں کے تخیل پر چڑھ گئے
زندگی کو مری زندگی مل گئی

مجبور اٹھیں خلاء میں وہ گھڑیاں حسین
 لمحے خوش رنگ پھر ذہن پر چھا گئے
 با نہیں مامی کی جانب بڑھیں حال کی
 زخم دل گیت دہرا اٹھے پیار کے

کتنی شدت سے چاہا تھا میں نے تجھے
 کتنا آباد تھا سو مناسبت جنوں
 وعدے تو نے بھی مجھ سے کئے تھے بہت
 اور سوچا تھا میں نے بھی "تیسرا ہوں"

میرے ہمدرد! مگر شہر والے ترے
 دے نہ پائے تجھے اذنِ قرب و قرار
 بڑھ سکی تو بھی آگے نہ اجداد سے
 آگیا کام فرسودہ رسموں کے پیار

آج غمِ حسانہ زندگانی میں پھر
 جل اٹھے تیری یادوں کے بجھے چراغ
 رقص کرنے لگی بزمِ شوق و جنوں
 پھر کھنک اٹھے احساسِ دل کے ایاغ

مرثیہ

اپنے تین روزہ پسر مخدوم بشیر کی وفات پر

کیوں تین دن میں روٹھ گیا میرے خوبرو
تو عمر آنکھ روے گی تیرے لئے ہلو

تھی دید مختصر تری لسیکن یہ حال ہے
پھر تا ہے آج بھی مری آنکھوں میں تو ہی تو

آنے سے تیرے رات میں تھی ہر سو روشنی
جانے سے تیرے دن میں اندھیرا ہے چار سو

اس تین دن میں سپنے بنے ہم نے تین سو
اے کاش! نہ جاتا تو یوں داغ آرزو

سرفانداں کا تجھ سے ہمالہ سا تھا بلند
تھا باپ کا وقار، تو تھا ماں کی آبرو

پا جاتے چار بھائی ترے فیض پنج جتن
مخدوم ساتھ ان کے جواں ہوتا نیسر تو

معصوم بہنیں روتی ہیں شائع کے ساتھ ساتھ
آیا بھی اور گیا بھی اچانک کہاں یہ تو

نذر زور مرحوم

مہنوم ڈاکٹر زور مرحوم کے مشاعرے میں پڑھی گئی



جہاں کہیں بھی چلی عظمتِ دکن کی بات
کچھ اور نکھری وہاں زورِ علم و فن کی بات

وہ زور جو تھے درخشاں منارہ اردو
وہ زور جو تھے مکمل ادارہ اردو

وہ زور جن کی تھی تحقیق شاہکارِ سخن
وہ زور جن کی تھی توفیق یادگارِ سخن

وہ زورِ نخت کھنڈر کا جنھوں نے چھپکایا
وہ زور کھوج نکالا جنھوں نے اک ہیرا

بغیر زور ادھوری ہے فکر و فن کی بات
بغیر ان کے مکمل نہیں دکن کی بات

وقار و فخر مہنر، شانِ زور باقی ہے
وہ دیکھو آج بھی ایوانِ زور باقی ہے



آدمی

قتل نے

خون نے

ظلم نے

سراٹھایا بہت

یوں ہی ہر دور میں

آدمی

قتل ہوتا رہا

ظلم سہتا رہا

عدل کچلا گیا

اور حق چھین گئے

اور اصولوں کے سینے پہ اڑتا رہا

اک علم جبر کا

ہاں مگر

یک بیک

قتل کے خون کے ظلم کے دور میں
آدمی جاگ اٹھا

تھر تھرایا فلک

اور زمیں کانپ اٹھی

پھر اصولوں نے

حق اور انصاف نے

سرکچل ہی دیا

قتل کا

خون کا

ظلم کا



تہنیت

اتحاد محرم جناب حسینی شاہد مرحوم کو ڈاکٹرٹ کی ڈگری ملنے پر کہی گئی



نظرِ نظر میں ہے اک ایک ذرۂ اب روشن
خوشا کہ ٹوٹ گیا آج تیسرگی کا فسوں
قدم قدم پہ ہے مینارِ نور کا پر تو
ہے شہر آج اجالوں کا، رہگزارِ جنوں

ہے آج قافلہٴ آرزو بہت سرور
کہ ایک راہِ و شوق کامیاب ہوا
طلب کی راہ گزر میں جیلے چراغ کئی
پتہ حیات کی منزل کا آج مل ہی گیا

ہر ایک لب پہ مسرت کا آج ہے مژدہ
فلک پہ اڑنے لگے صاحبِ ہنسِ شاہد
نوید! شعروادب کا دیار ہے رقصاں
خوشا خوشا کہ بنے آج ڈاکٹر شاہد



سفید خون

میں بھی ہوں
 آدمی اک عجب دوستو
 ہو کے سنار سے
 اک ذرا سا جدا
 رو رہا ہوں
 سمندر لہو کا سدا
 اور لہو سے مرے
 تر بتر گھر مرا ہو گیا
 ہاں مگر
 اسی مرے گھر سے سنسار کو
 کیا غرض
 خون تو
 آج سب کا
 ہوا ہے سفید

گاندھی جی کی نذر

اے ہمتسا کے پجاری اے سکوں کے دیوتا
اتحاد و دوستی کی راہ میں تو مٹ گیا

کتنی بے رحمی سے مارا آہ! ظالم نے تجھے
عقل کے اندھے کو حاصل کیا ہوا اس پیاسے

قدرِ انساں ہوتی ہے انسان مرجانے کے بعد
سوچتا ہے رند گھر کی ہوشی میں آنے کے بعد

روح لرزاں، چشم پریم، دل فگار رنج و غم
اٹھ رہا ہے آج ہر سینے سے طوفانِ الم

مہر و مہ غمگین، افسردہ زمین و آسماں
پھوٹتے ہیں آج لب سے چمکدے آہ و فغاں

آج تیرے سوگ میں نالاں ہے ہر اک بھارتی
آہ! تجھ بن کس قدر ویراں ہے سا برہمتی

دیوی بھی جمہور کی ہے کس قدر افسردہ آج
لے سکوں کے دیوتا، بالو عقیدت کا خراج

تضحیک

تجھ سے پہلے بھی تھا معمورہ ہستی ویراں
تجھ سے مل کے بھی نہ آباد ہوا.... دل میرا
تجھ سے پہلے بھی تھی تصویرِ تمت بے رنگ
تجھ کو پا کے بھی ہر اک خواب ادھورا ہی رہا

ہے گم تجھ سے مجھے اور نہ شکایت کوئی
مشوق کو میرے ہی شاید نہ سکوں راس آریا
میں کہ ہوں اپنے ہی احساسِ وفا سے نالاں
خوش مرے پیار ہی کو رنگِ غم ویاں آریا

ہاں! مگر تجھ سے یہ کہہ دوں تو برا بھی کیلے
تو نے اک جذبۂ الفت کا اڑایا ہے مذاق
پیار تجھ کو نہ سہی مجھ سے مگر تو نے دوست
ایک فنکار کی عظمت کا اڑایا ہے مذاق

کی کھی تعریف یہ کیوں تو نے مری نظموں کی
 تو نے غزلوں کو مری یوں ہی سراہا کیوں تھا
 کیوں ان افسانوں کو سینے سے لگایا تو نے
 جین میں تھا میں نے ترے پیار کا امرت گھولا

اے مرے دوست مری جھوٹی پرستارِ فن
 ایک فنکار کی تو قیہ رہے اس کا فن ہی
 اے کہ تو نے نہ دیا ہوتا مجھے تلخ فریب
 اے کہ تو ایسا تو توہین نہ کرتی فن کی

چپادر

سرِ راہ کل ایک ننھی بھکارن
 چلی جا رہی تھی
 سبھی ہنس رہے تھے
 تماشائی تھے سب
 مگر دے نہ پائی
 کسی نے بھی بڑھ کر
 اُسے
 ایک چپادر

۱۱ جنوری ۱۹۶۶ء

لال بہادر شاستری کی وفات پر



نسیم صبح لے آئی ہے آج کیسی خبر
روش روش بھی صف درد و آہ کی یارو
ستم اجل نے یہ توڑا ہے آج پھر کس پر
فغاں و کرب میں ڈوبی ہے زندگی یارو

دماغ آج پریشاں ہے، قلب ہے مضطر
ہر اک جہیں پہ تردد ہے اک، سکوں کی جگہ
غضب یہ ٹوٹا ہے کیسا ہر ایک سینے پر
بدن بدن میں ہے سیما اب لہو کی جگہ

ہوا ہے آج نہ جانے یہ کیا وطن سے دور
خلوص کا یہ وطن، ہند کا محب لٹا
یہ کیا ہوا کہ یکایک ہوا جہاں رہ بخور
غضب غضب کہ امیر تلاش اسن گیا



پیار کی موت

(سامینٹ)

میری ہلام! ہے یہ اچھا کہ تمہیں بھولوں میں
مجھ سے مدت سے ملیں تم نہ مجھے بھی کوئی
چاہ پہلی سی رہی تم سے نہ وہ آس رہی
ہے مناسب کہ تمہیں اب نہ کبھی چھولوں میں

شب کی تاریکی میں کل ایک ستارا ٹوٹا
دوسرے لمحہ تمہارے وہ خیت نامے
شمع کی نذر ہوئے جاتے تھے اک اک کر کے
دور سناتے میں کتا کوئی رواٹھا تھا

رشتک صد ہوش تھی دیوانگی کل رات مری
آج تعبیر حقیقت لئے آئی ہے سحر
سارے اخباروں میں شادی کی تمہاری ہے خبر
پیش بندی اجل شوق کی سپح ہی نکلی

ہے بجا ٹوٹی ہوئی آس کو کفنا دوں میں
قبرِ ماضی میں مرے پیار کو دفن دوں میں

نذرِ حسینؑ

یزیدِ لویٰ کے ستم کو اٹھائے جاتے ہیں
حسینؑ! شانِ صداقت بڑھائے جاتے ہیں

خدا کے نام پہ سب کچھ لٹائے جاتے ہیں
فلاحِ دین کے لئے کام آئے جاتے ہیں

ہزاروں شہرِ یریدی و قسار کی خاطر
فقط نہتے بہترؑ کو ڈھائے جاتے ہیں

ہے جن کی ملک میں کوثر، فرات پر افسوس
ابنیں کے واسطے پہرے بٹھائے جاتے ہیں

سلام! ان کی ولیبری کو اور عظمت کو
خلافِ ظلم جو آواز اٹھائے جاتے ہیں

ہو ازمانہ مگر پھر بھی "ذکرِ کربل" پر
ہم آہ! آج بھی آنسو بہائے جاتے ہیں

دکھائی دیتا ہے شاغلِ حسینؑ کا کردار
خدا کی راہ میں جب سر کٹائے جاتے ہیں

جھوٹی شان کے شہزادو

جھوٹی شان کے شہزادو تم

اب بھی سنبھلو

دیکھو

چاند بھی تم جیسا ہی

جھوٹی شان کا شہزادہ ہے

وہ

سورج کی چھایا اور ٹھہرے

رات کو چھپ کر

گھر گھر جا کر

پھرتا ہے بس چوری کرتا

جھوٹی شان کے شہزادو تم

اب بھی سنبھلو

دیواولی دو ہے

دیواولی کی جوت جگے ہے، ملے گلے ہر کوئے
ساجن تیری دوری میں من میرا پاگل ہوئے

کیا پوچھو ہو مشرو مجھ سے دیواولی چھ کیا لائے
سب کے گھر میں جگمگ جگمگ مجھ کو اندھیرا کھائے

دیواولی کی رین نرالی، اک اک پل مسکائے
ہوگا اچھا ایسے میں گر تو بھی ساجن آئے

دیواولی کی رات ہے ٹھنڈی، ٹھٹھے جائیں لوگ
میرے من کا لاوا پوچھے ہوگا کب سنجوگ

نظموں غزلوں میں تو دکھایا شاغل جی نے زور
شعرو ادب میں ہوگا ان کے دوہوں کا بھی شور

نئے سال کا عہد

قومی یکجہتی کے پس منظر میں



نیا سال پھر آ رہا ہے رفیقو
 بہ صد شوق ہم اس کا سوا گت کریں گے
 چلو عہد کر لیں یہ سب آج مل کر
 سدا ایک ہو کے جیتیں گے مریں گے

وطن اپنا یا رو ہے جنت کا منظر
 وطن اپنی مسجد ہے، مندر ہے سندر
 وطن اپنا دراصل گرجا ہے پیارا
 وطن اپنا بے مثل ہے گرد وارا
 چلو عہد کر لیں یہ سب آج مل کر
 سدا ایک ہو کر جیتیں گے مریں گے

وطن اپنا اقبال کا ایک نغمہ
 وطن اپنا ٹیگور کا پیارا سپنا
 وطن اپنا تلسی کی فکر حبیبیں ہے
 وطن کیفی کی نظم اک دل نشیں ہے

وطن اپنا غالب کا حسن تغزل
 وطن اپنا میر تقی کا تحمل
 وطن شہ ظفر کا موثر سخن ہے
 وطن اپنا میرا کا غم گیں بھجن ہے
 چلو عہد کر لیں یہ سب آج مل کر
 سدا ایک ہو کر جیئیں گے مرے گے

وطن قطب شاہی کے دل کی لگن ہے
 وطن لکشمی رانی جھانسی کا فن ہے
 وطن اپنا اکبر کا دین الہی
 وطن اپنا خواجہ کی گوتم کی دھرتی
 وطن چاند سلطانہ بی بی کی عظمت
 وطن شیر دل ٹیپو سلطان کی جرأت

چلو عہد کر لیں یہ سب آج مل کر
سدا ایک ہو کہ جئیں گے مرے گے

وطن ہے عزیز و ہمت الہ کی عظمت
وطن یار و گنگت و جمن کی ہے عظمت
وطن اپنا صبح بتا رہا نرالی
وطن دوستو شام دلکش اودھ کی
وطن اپنا تاج خلوص و محبت
وطن اپنا ہے ایک شہکارِ قدرت

چلو عہد کر لیں یہ سب آج مل کر
سدا ایک ہو کہ جئیں گے مرے گے

وطن سرفروش بہادر بھگت کی
وطن باپو جی کے لہو کی نشانی
وطن نہرو جی کا سیاسی تدبیر
وطن ہے مقام سکون بہادر
وطن راجو گاندھی کا قلبی تعلق
وطن اندرا جی کے دل کا تصدق

لے : لال بہادر شاستری

چیلو عہد کر لیں یہ سب آج مل کر
سدا ایک ہو کر جیتیں گے مریں گے

وطن آندھرا ہی نہیں ہے یہ سمجھو
وطن صرف بنگال ہی ہے نہ سموچو

وطن صرف پنجاب ہے نا اڑیسہ
وطن ناگالینڈ اک نہیں ہے ہمارا

وطن اپنا میگھا کیہ ہی نہیں ہے
وطن صرف کرناٹکا ہی نہیں ہے

وطن صرف سکم کو ہرگز نہ جاناؤ
وطن صرف آسام کو تم نہ جاناؤ

وطن اک تری پورہ ہے یہ غلط ہے
وطن صرف ہریانہ ہے یہ غلط ہے

وطن سارے صوبوں کا پیارا وطن ہے
وطن ایکتا کا پیارا وطن ہے

چلو عہد کر لیں یہ سب آج مل کر
سدا ایک ہو کر جیتیں گے مریں گے

وطن اک علاقہ نہیں ڈوگری کا
وطن کب رہا ہے مرہٹوں کا اپنا

وطن صرف مدراسیوں کا نہیں ہے
وطن گوجری داں کا ورثہ نہیں ہے

وطن صرف اردو نہ ہندی زباں کا
نہیں ہے وطن اک پٹاری زباں کا

وطن ایک مجموعہ ہے ہر زباں کا
کہاں اس کو اہل وطن نے سمجھا

چلو عہد کر لیں یہ سب آج مل کر
سدا ایک ہو کر جیتیں گے مریں گے

دارورسن

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
 جہاں ہم ہیں وہاں دارورسن کی آزمائش ہے

مرزا غالب



غزلیں





نظر سے کہانی سنائے چلا جا
چراغِ محبت جلانے چلا جا

مصیبت بھی اک روز راحت بنے گی
مصیبت میں تو مسکرائے چلا جا

جہاں ہر طرف بجلیاں ٹوٹتی ہیں
وہاں تو نشیمن بنائے چلا جا

پہنچ جائے گا اپنی منزل پہ اک دن
نگاہیں کسی سے ملائے چلا جا

زمانہ یہ شاغل نہ تیرا بنے گا
زمانے کو اپنا بنائے چلا جا





عزم منزل رسی کی بات کریں
دوستو زندگی کی بات کریں

عظمت آدمی کی بات کریں
شانِ اسکندری کی بات کریں

دین و دنیا کی ، کفر و ایمان کی
آج آؤ سبھی کی بات کریں

رنج و غم تو طہیں روز کے عنوان
ہر لحظہ و خوشی کی بات کریں

آج گیسوئے وقت سلجھائیں
پھر کبھی عاشقی کی بات کریں

قرعہٴ جسم جنگ بن جائیں
امن کی کائنات کی بات کریں

ہیں جہاں طاری ظلمتیں شاغل
ہم وہیں روشنی کی بات کریں





ہر حلقہ زنجیر کو پگھلائے ہوئے ہیں
کیا دار پہ کم گیت ترے گائے ہوئے ہیں

یا انجمن ناز کے ٹھکرائے ہوئے ہیں
یا شوق کا انجمام یہی پائے ہوئے ہیں

یا رات کی تاریکیاں رک رک سی گئی ہیں
یا آج وہ پھر زلف بدوش آئے ہوئے ہیں

معیارِ سخن پوچھتے کیا ہو مرے اشعار
ہر لب پہ ہر اک دل میں جگہ پائے ہوئے ہیں

اے عزمِ جواں! مردہ، نوید اے دمِ محکم
سنتے ہیں کہ منزل کے قریب آئے ہوئے ہیں

شاغل ترے اشعار میں کیوں سوز نہ ہوگا
انگارے ہیں الفاظ جو دہکائے ہوئے ہیں





نقوشِ ماضی تصور میں جب ابھرتے ہیں
دل و نظر میں مرے آپ رقص کرتے ہیں

کہا یہ کس نے تمہارے ستم سے ڈرتے ہیں
مگر یہ سچ ہے کبھی سر د آہیں بھرتے ہیں

شراب کہتے ہیں غم سارے دور کرتی ہے
مگر یہ کیا ہے کہ پیتے میں غم نکھرتے ہیں

جواب پسند و نصیحت یہی ہے اے واعظ
حیات پھل ہے گنہ کا گناہ کرتے ہیں

خمار و کیف ، فضا بھول جاتی ہے ہمدم
جب ان کے گیسوئے عنبر فشاں بکھرتے ہیں

تجھے فرازِ سخن گوئی مل گیا شاغل
کہ تیرے شعر دلِ یار میں اترتے ہیں





اشک پینے، درد سہنے اور غم کھانے کا نام
زندگانی ہے فقط غم ناک افسانے کا نام

سینہ زخموں سے مہک اٹھا، کنول غم کے کھلے
دوست! تیری یاد بھی ہے اک بہار آنے کا نام

دوستی بس یوں ہی ملنے کا نہیں اے کم نگاہ
دوستی ہے اصل میں دل، دل مل جانے کا نام

محوِ بزمِ زلف و قد، کچھ خبر بھی ہے تجھے
عاشقی ہے دارِ پرے خوف چڑھ جانے کا نام

دیکھ کر شاغلِ ادیب اب تجھ کو دنیا سے الگ
ذہن میں ابھرا کوئی بدست دیوانے کا نام





عکس رنج و ملال ہیں ہم لوگ
زندگی کا مال ہیں ہم لوگ

گاہ سادہ فسانہ صہیں ہمدم
گاہ رنگیں خیال ہیں ہم لوگ

سازِ ماضی، ربابِ فردا کبھی
اور کبھی چنگِ حال ہیں ہم لوگ

جس کا اب تک جواب بن نہ پڑا
ایک ایسا سوال صہیں ہم لوگ

دکھ جھٹتے ہیں ہم پہ یوں جیسے
اک غنیمت کا مال ہیں ہم لوگ

پیتے ہیں زہرِ اشک، جیتے ہیں
عزم و دم کا کھسال ہیں ہم لوگ

دہر کو جو عطا کرے مستی
ہاں! وہی مست حال ہیں ہم لوگ

تار و تیرہ ہو بزمِ اپنی کیوں
شمعِ روشن خیال ہیں ہم لوگ

ہے متاعِ حیات، غمِ تیرا
صاحبِ جاہ و مال ہیں ہم لوگ

ہم سے چپکے گی بزمِ فن ہر شب
ماہِ تابِ محال ہیں ہم لوگ

یہ تعلیٰ بہتیں، ہے سچ شاعر
شاعری کا کھسال ہیں ہم لوگ



وہ رسم و راہ تیرگی اب بھی گئی نہیں
چہرے بدل گئے ہیں، کوئی اجنبی نہیں

دردِ جہانِ عشق، غمِ تلخیِ حیات
تیرے نثار اب کسی غم کی کمی نہیں

اے جانِ بزم! تجھ کو خبر ہے ترے بغیر
ہر شمع جل رہی ہے مگر روشنی نہیں

اس شاعری سے ہم کو یہی تجربہ ہوا
اک ہم ہیں سب کے اور ہمارا کوئی نہیں

ہر لب پہ جھگڑاتے ہیں سورج کے تذکرے
یہ اور بات ہے کہ کہیں روشنی نہیں

شاغل! چلے ہیں جانبِ منزل تو سب مگر
اکثر یہی ہوا ہے کہ منزل ملی نہیں





شبِ فراق میں جب آسماں سنورتا ہے
کچھ اور رنگِ تمنائے دل نکھرتا ہے

کچھ اور زخمِ لگاتی ہے گردشِ دوراں
تمہارے پیار کا جب کوئی زخم بھرتا ہے

مجھے نہیں ہے کوئی شک تری وفا پہ مگر
نہ جانے پھر بھی کیوں دل میں گماں گزرتا ہے

ترا خیال ہے یا ہے ہجومِ نور کوئی
ہر ایک لمحہ شبِ ہجر کا نکھرتا ہے

کچھ اور کھلتے ہیں ان کی نوازشوں کے گلاب
کچھ اور رنگِ غمِ زندگی نکھرتا ہے

مری نگاہ سے دیکھو کہ عہدِ حاضر میں
ہر ایک نقشِ نئے دور کا اُبھرتا ہے

یہ بات جس نے کہی ٹھیک ہی نہیں شاغل
"خلوصِ فکر سے رنگِ غزل نکھرتا ہے"



راہزن راہوں میں اپنے جال پھیلاتے ہے
 ہم مگر اپنی ہی دھن میں جھومتے گاتے رہے
 دور جتنی دور تک تھیں رات کی تاریکیاں
 دور اتنی دور ہم راہوں کو چمکاتے رہے
 منحصر ہے اپنے اپنے عزم پر منزل رسی
 قافلے یوں تو بہت آتے ہے جلتے ہے
 ہر تسلی دشمن آرام جہاں بنتی گئی
 آپ کے حظ اور دل کے زخم گہراتے ہے
 جانے کس کے نقش پا تھے آنے والے قافلے
 ہر قدم پر خونِ دل کے پھول برساتے رہے
 بڑھ گئے کچھ اور شاغل جانبِ زنداں جو ہم
 تقویت کچھ اور دل کے حوصلے پاتے رہے





تری نگاہ ملی، اک غمِ زمانہ ملا
ترے نثار! تری انجمن میں کیا نہ ملا

وہ بد نصیب جو تیرے ستم سے بچ نکلے
انہیں کہیں بھی زمانے میں آسرا نہ ملا

ہمیں نہ بھول سکی دارِ پیر بھی یادِ دوست
انہیں حرم کی فضاؤں میں بھی خدا نہ ملا

کریں کیا ان کی جفاؤں کا اب گلہ کہ ہمیں
مزاجِ دہرہ بھی کچھ غیر دوستانہ ملا

ہزارہ دیر و حرم راستے میں آئے مگر
سوائے میکدے کے ہم کو راستہ نہ ملا

سنائی جب بھی غزل ہم نے اک نئی شغل
زمانہ سمجھا اسے اک نیا ترانہ ملا





ہم سحر کے دیوانے، جس طرف کو چلتے ہیں
 ہر قدم نہ واہم، پاؤں پر چلتے ہیں
 اک ترے بدلنے سے، ہم بدل نہیں سکتے
 ہم اگر بدلتے ہیں، روز و شب بدلتے ہیں
 جس میں ہونہ کچھ احساس، اس کو دل کہیں کیسے
 دل وہی ہے دامن میں، جس کے درو پلتے ہیں
 نشہ جنوں اپنا، خود ہی اک سہارا ہے
 گرتے ہیں بظاہر ہم، اصل میں سنبھلتے ہیں
 آتی ہے خوشی بھی اب، اک ہجوم غم لے کر
 ہنستے ہیں تو آنکھوں میں، اشک بھی چلتے ہیں
 انقلابِ دوراں کا، بس یہی خلاصہ ہے
 جو فلک پر اڑتے تھے، اب زمیں پر چلتے ہیں
 خود غرض زلمنے کی، دوستی ارے تو بہ
 آدمی ہی کیا شاغل، دل بھی اب بدلتے ہیں





اداں اداں ہے ماحول، خوشگوار کریں
غمِ حبیب ادھر آگے تھکوا پیار کریں

چلے ہے بات چمن میں بہار کی، ہم بھی
چلو کہ جیب و گریباں کو تار تار کریں

کسی نے آج نگاہیں چرائی ہیں ہم سے
کسی کا صحنِ چمن میں پھر انتظار کریں

کچھ اور تیرگی، ظلم بڑھ چلی ہے، چلو
کچھ اور مشعلِ دل ہم بھی شعلہ بار کریں

ترے ہی ذکر سے رونق ہے محفلِ دل میں
ترے بغیر بھلا خاک روزگار کریں

کبھی کبھی ہی چلیں سوئے میکہ شافل
کبھی کبھی ہی سہی، یادِ چشم یار کریں





فضائے سخن چمن آج لالہ فنام کریں
چیلو چیلو کہ بہاروں کا اہتمام کریں

ہجومِ زاہداں کیسا، یہ کیسی ہنرمے
چیلو کہ ہم بھی کسی رند کو امام کریں

ہیں ہم دیوانے، مگر ملتی ہے وہی منزل
جہاں جہاں پہ رکھیں اور جہاں قیام کریں

جنوں سے کچھ تری رسوائیاں نہیں مقصود
جنوں سے ہم نے یہ سوچا ہے تیرا نام کریں

اس انجن سے نکل کر یہ سوچ ہے شاغل
گزاریں صبح کہاں، اور کہاں پہ شام کریں





وقارِ درد و غم زندگی نہیں معلوم
 نہیں ہے آؤدھی کیوں آؤدھی نہیں معلوم
 سلوکِ دوست کا شکوہ نہیں، مگر کب تک
 ہمیں ڈبوئے گی یہ سادگی نہیں معلوم
 تمام عمر رہے حادثہ شکار مگر
 رہی کیوں یاد تری چوٹ ہی نہیں معلوم
 غضب کہ پیار کی راہوں میں آج چل نکلے
 وہ جن کو نام و فسا بھی ابھی نہیں معلوم
 چمن کھلا تو چپکے ہم جراثیمِ دل کا
 کلی کھلے گی کب اک اس کی نہیں معلوم
 سکونِ دل نہ قرارِ حیات ہے ہم کو
 ہو ختم کب یہ نوازش تری نہیں معلوم
 ہمارے پیار کو شاغل نہ مل سکے گا پیار
 ہمیں کچھ کا بھی اپنا کوئی نہیں معلوم





چراغِ دردِ جلاؤ کہ روشنی کم ہے
 جنوں کی بزمِ سجاؤ کہ روشنی کم ہے
 نہ چھیڑو ذکرِ تعفُّنِ بھرے زمانے کا
 کلابِ زخمِ کھلاؤ کہ روشنی کم ہے
 نہ جانے چھپ گئی منزل کہاں اندھروں میں
 مرے قریب تر آؤ کہ روشنی کم ہے
 تمہارے شہر کی شاید ہے صبحِ شبِ پرور
 یہ کیا ہے درنہ بتاؤ کہ روشنی کم ہے
 نہ بزمِ فکر ہے روشن نہ جامِ دلِ لبریز
 غموں کا نہ ہر پلاؤ کہ روشنی کم ہے
 صدایہ دیتا ہے شاغل رہِ وفا سے کون
 لہو جگر کا جلاؤ کہ روشنی کم ہے





فریبِ ننگِ جنوں، نامِ دارِ جھوٹا ہے
 یہ کیسا دور ہے ہر دوستِ یارِ جھوٹا ہے
 ہے لب پہ نقدِ محبتِ نظر میں سودِ ہوس
 ہوس کے تاجرو! یہ کاروبارِ جھوٹا ہے
 کہی تھی کل جو کسی نے، وہ بات ہے گھر گھر
 یقین فریب ہے اک، رازدارِ جھوٹا ہے
 یہ کیا کہ بور ہے ہیں پھول، آنکھ میں کانٹے
 یا آج آپ ہی کا انتظارِ جھوٹا ہے
 وقارِ چاکِ گریباں کی خیر ہو یا رو
 خزاں کا دور ہے، جشنِ بہارِ جھوٹا ہے
 غمِ خلوص کی رفعت کے سامنے شافل
 ہر ایک اوجِ غم روزگارِ جھوٹا ہے





اُن کھلی کلیوں سے خوشبو کہو کیا آئے گی
 جب یہ کھل جائیں گی، اک عمر گزر جائے گی
 شب نہ ٹپکائے ستارے نہ سہمی صبح کی گود
 میرے اشکوں کے ستاروں سے تو بھر جائے گی
 دیکھو نظروں سے مرے تم کو بھی ظلمتِ نظر و
 نور کا شہر ہر اک رات نظر آئے گی
 آج جلتی ہے جلے دھوپ میں دنیا کی حیات
 گیت آ پھل میں کسی پیار کے، کل لگائے گی
 اپنی اک ایک وفایا رو ہے عنوانِ خلوص
 دشمنی آپ کی سرخی کہو کیا پائے گی
 سست رو راہِ زخم لگائیں جتنے
 اتنی ہی تیز روی اپنی بڑھی جائے گی
 پھاڑیں وہ لاکھ گلا، چھینیں وہ سدہا شاغل
 بات وہ اپنے ترنم کی کہاں آئے گی





مشعلِ درد کو بھڑکاؤ کہ کچھ رات کٹے
 آج ہر زخم کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے
 پھر چیلے ان کی حدیثِ لب و رخسارِ جلو
 دارِ پرہم کو چڑھاؤ کہ کچھ رات کٹے
 وہ تو سب بھر گئے اب تک جو ملے تھے یارو
 اب کوئی زخمِ نیا کھاؤ کہ کچھ رات کٹے
 تلخیِ زیت کے سنٹے سے ڈر لگتا ہے
 پھر غمِ یار کو بلواؤ کہ کچھ رات کٹے
 اک نہ اک حادثہ ہر سالس کے ساتھ آتا ہے
 میری جاں تم بھی چلی آؤ کہ کچھ رات کٹے
 سرد و خاموش ہے اب انجمنِ فنِ شاغل
 شعرواحساس کو سلکاؤ کہ کچھ رات کٹے





اہل شہرت کو فقط نام سے دلچسپی ہے
 اور ہم ہیں کہ ہمیں کام سے دلچسپی ہے
 ان سے نسبت نہ ہمیں ربط ہے ان سے کوئی
 یوں ہی پہچان سکا ہے نام سے دلچسپی ہے
 موم کی طرح سے ہیں جلنے کے عادی ہم لوگ
 صبح کا ذکر ہی کیا شام سے دلچسپی ہے
 فن کی خاموش ریاضت ہے انعام ہمیں
 ہم کو کب آپ کے انعام سے دلچسپی ہے
 ساتھ چھوڑا ہے جس انجام کے در سے تو نے
 دوست! ہم کو اُسی انجام سے دلچسپی ہے
 شخص وہ کون ہے جس نے یہ کہا تھا شاغل
 "ہم کو اس شاعر خوش کام سے دلچسپی ہے"





روشنی کو مانگے کی، روشنی نہیں کہتے
یارو! چاند کو سورج ہم کبھی نہیں کہتے

رنگِ شعر کھلتا ہے خونِ دل کے ملنے سے
صرف شعر کہنے کو، شاعری نہیں کہتے

دوستی گلستاں ہے اک شریف جذیہ کا
دل میں کانٹے بونے کو دوستی نہیں کہتے

رہبری وہی ہے جو منزلوں کو چمکائے
بانٹنے کو تاریکی رہبری نہیں کہتے

پیار کا تعلق بھی اک سراب ہے ورثہ
عمر بھر کے ساتھی کو اجنبی نہیں کہتے

نام ہے وفا شاغلِ مستقل مزاجی کا
وقت کے غلاموں کو آدمی نہیں کہتے





اب احترام درد و غم دل نہیں رہا
یا آدمی ہی پیار کے قابل نہیں رہا

آدابِ بزم کا یہ نیا روپ دیکھنا
اک پل بھی میری سمیت وہ مائل نہیں رہا

ہر فرد پھر رہا ہے لئے بے حسی کی لاش
جینے کا جیسے اب کوئی حاصل نہیں رہا

مرتے ہیں جیسے جی نہیں ہر دم یہی ہے سوچ
قاتل بھی آج کس لئے قاتل نہیں رہا

کیا تم سے داؤد بن ملے شاعر گرو کہ اب
مومن پرست غالب محفل نہیں رہا

غم پیار کا ہے چہرہ دل کا حسین تل
چہرے پر دل کے آج وہی تل نہیں رہا

شاغلِ ادیب! دشمنی دوستاں کی خیر
سینے میں ایک زخم ہے، اب دل نہیں رہا





راہِ وفا میں یوں تو کئی ہم سفر ملے
لیکن یہ کیا ہوا کہ ہمیں دارِ پر ملے

اب چشم سے لہو مری ٹپکے ہے رات دن
خواہش تھی کتنی ہم کو بھی دردِ جگر ملے

بانٹا کئے ہیں سب کے غم و درد ہم سدا
ہر اک سے پیلا ہم کو بھی یار و مگر ملے

جس موڑ پر حیات کے بچرے تھے مجھ سے تم
پھر موڑ پر اُسی مجھے کیوں غم بھر ملے

ہم شام ہی سے شب کو لگا لیتے ہیں گلے
ہے آس بس یہی کہ کسی دن سحر ملے

شاغلِ ادیب! فن بھی ہے اب مصلحت پسند
ممکن نہیں کہ سب کو خراجِ ہمنس ملے





حالات کے ہاتھوں میں جو پتھر نہیں ہوتا
زخمی کبھی اس طرح مراسر نہیں ہوتا

چلنا ہے ضروری کہاں ہر شخص کے پیچھے
سنسار کا ہر فرد پیسمبر نہیں ہوتا

آگے مرے ہر ہاتھ میں آتا ہے نظر پھول
پیچھے مرے کس ہاتھ میں خنجر نہیں ہوتا

تھا مجھ کو ڈھکیلا کسی اپنے نے کنویں میں
دور اب بھی لگا ہوں سے وہ منظر نہیں ہوتا

مذت ہوئی گھر چھوڑے ہوئے مجھ کو مگر آج
کیا جانے کیوں دل سے جدا گھر نہیں ہوتا

ہے دوش پہ ہر شخص کے افلاس ہی کی لاش
ہر شخص مقدر کا سکندر نہیں ہوتا

کل شب وہ مرے حال پہ دل کھول کے ٹوٹے
یہ حادثہ معلوم ہے اکثر نہیں ہوتا

آنکھوں میں ہمیشہ ہی نمی رہتی ہے شغل
دور اشکوں کا ہم سے یہ سمندر نہیں ہوتا





سونے کی طرح میں بھی ہر دور میں تپا ہوں
مجھ کو زمانہ دیکھے، کھوٹا نہیں کھرا ہوں

کیا سوچ میری اپنی ہے قید تیرے غم میں
یا اپنی ہی وفا کے جنگل میں، میں پھنسا ہوں

تم بے ضمیر ہو کر برسوں سے پھر رہے ہو
میں آج بھی وفا کی دلیہیند پر کھڑا ہوں

یارو! تمہیں مبارک اس شہر کی خدائی
ہے کیا مرا کہ میں تو اک بندہ خدا ہوں

وہ جو تھا گل کا طالب، بھاگے ہے دور مجھ سے
جیسے بول کا میں اک پیڑ ہو گیا ہوں

کھو کر انا تم اپنی، ہو دور ہر نظر سے
میں کھو کے اپنا سب کچھ، ہر دل میں جا چکا ہوں

کیا ساتھ لے چلو گے، شاغل ادیب ہم کو
میں ساتھ اپنے ساری دنیا کو لے چلا ہوں





ہم نے نہ تم کو جانا، قاتل ہو کہ مسیحا
دنیا سے پوچھ لینا، تم ہو حقیقتاً کیا

اس کو چھپا نہ پایا، یہ رات کا اندھیرا
دن کی طرح ہے چمکے، ہر گھاؤ میرے دل کا

ہے کون سی یہ بستی، انساں کا ذکر ہی کیا
سایہ بھی اب لگے ہے، ہم کو یہاں پرایا

حسرت سے رات دن میں جس درد کو دیکھتا ہوں
دستک میں خود بھی اس پر برسوں سے نہ پایا

ہر فردِ شہر کی اب، خطرے میں زندگی ہے
سولی پہ وقت کی ہے، ہر فرد آج لٹکا

ملک نہیں کسی سے اس کا علاج یارو
یہ درد وہ ہے جس کا، کوئی نہیں مسیحا

شاغلِ ادیب! ہم نے چھوڑا ہے پیچھے شب کو
اپنے سفر کی منزل، تہذیب کا سویرا





ہر گام پر ہے ریت کی دیوار دیکھنا
منزل ہے اُن سراپوں کے اُس پار دیکھنا

ہے راج نفرتوں کا، محبت کے شہر پر
ہر سمت ناگ دیوں کی پھنکار دیکھنا

مٹی کے برتنوں کی سجائے ہو تم دکان
پتھر حید سے مارے نہ سنسار دیکھنا

گزارا ہے اس طرف سے ہلا کو صفت کوئی
دو تہے بلکتے جیتے بازار دیکھنا

جلنے نہ پائے کوئی مکاں اہل شہر کا
نفرت کے پھیلے شہر میں اسرار دیکھنا

ہیں بند جن میں تجرے روشن دماغ کے
گھر میرے ان کتابوں کے انبار دیکھنا

عصری ادب کا آئینہ نہ یہ بھی ہیں یا نہیں
شاغل ادیب! یہ مرے اشعار دیکھنا





اپنے لہو کے رشتوں نے دھوکہ دیا سدا
بیٹی میری ہوئی نہ ہی بیٹا مرا ہوا

منزل ہے کون سی، بھلا جادو ہے کون سا
ہر راہرو لگے یہاں جلتی ہوئی چتا

سنسار کیا ہے سینا، یہ دنیا ہے حشر اک
سینا ہے ایک جھوٹ، یہ جینا عذاب سا

کس شے کو اپنی کہہ کے کروں اس پہ ناز میں
ہے میرا کیا سمجھی تو ہے اُس کا دیا ہوا

پینے پہ تو یہ کہتا ہے "پینا حرام ہے"
تو بہ یہ میری کیوں ہے یہ چہرہ ترا بکھا

نیکی پہ بغض اور بدی پر تھا تمہیں
افسوس! یہ ہمارے رقیبوں کا حال تھا

شاغل ادیب! مجھ سے بھی مل کے رو پڑے
پیکر ہوں ان دنوں میں کئی حادثات کا





سپتوں کانگر ہے کہ یہ شمشان ہے بابا
ہر گام پہ جلتا ہوا انسان ہے بابا

لا حول پڑھیں کس پہ دعائیں دیں کسے ہم
اس دور کا انسان بھی شیطان ہے بابا

آرام کڑی دھوپ میں ہے مجھ کو مگر وہ
بادل کی گھٹی پھاؤں میں حیران ہے بابا

جب بات وہ کرتا ہے تو لگتا ہے فلاطون
یوں دیکھتے ہیں وہ بڑا نادان ہے بابا

جس رشتے کی تقدیس پہ قربان ہے ستارہ
اُس رشتے سے افسوس وہ انجان ہے بابا

شاعِل کا ادب میں بھی بڑا نام ہوا ہے
شاعِل پہ بہت آپ کا احسان ہے بابا





جب سے ملی ہے چشمِ غم روزگار سے
ہر درد کو قریب کیا ہم نے پیار سے

کلیاں فسدہ، پھول بجھے، آشیاں جہلا
گلشنِ گویا ملا ہے بھلا اس بہار سے

کل رات ہم کو نیند نہ آئی بجا مگر
کل شب رہے ہیں وہ بھی بہت بقرار سے

نقاد سے اوپ رہے محفوظ اس طرح
محفوظ پھول ہوتے ہیں جس طرح خار سے

ترتیب دیتی ہے ہمیں تاریخِ پیار کی
ہم کو نہیں ہے کام، دلوں کے غبار سے

شاغل! مری نگاہ میں رقصاں ہیں دونوں رات
"نفرت خزاں سے ہے محبت بہار سے"





پہلے ہی سے اس گھاؤ پہ ہے یاس کا پتھر
تو رکھ نہ مرے زخم پہ احساس کا... پتھر

ہوں آج پڑا راہ میں بے مول ہوں، سچ ہے
کل میں بھی بنوں گاکسی اہٹا میں، کا پتھر

اس قبر کے ماتھے پہ سجا ہے کوئی کتبہ
یا وہ ہے مرے سپنے کے بن باس کا پتھر

ممکن نہیں ہے مسخ نہ ہو زلیست کا چہرہ
ہر شخص لئے ہاتھ میں یاس کا... پتھر

یوں تو دلِ انساں پہ ہیں پتھر کئی شاغل
لیکن نہیں ہے پیت کی بُو باس کا پتھر





درقت وہ زلیست کا سہارا ہے
تیرے صحبت میں جو گزارا ہے

کم ہے جتنا بھی اس پہ خوش ہوں ہم
حاصلِ عشق غم مہسار ہے

تم کو شاید پتہ نہیں لیکن
ہم نے اکثر تمہیں پکارا ہے

جھوم اٹھوں گا میں جی کے اے ساتی
مجھ کو کافی ترا اشارہ ہے

چھو کے آج تک نہ ہم تجھ کو
لوٹ بھی گویا فلک کا تارا ہے

شاعری اصل میں ہے کو ہر مکتبی
پھر بھی ہم کو یہ لفظ "پیارا" ہے

جستنا فنکار کو دبایا گیا
فن نے امتنا سے ابھارا ہے

دشمنوں کی نہ پوچھو لے شاغل
ہم کو خود دوستوں نے مارا ہے





پھوٹا تھا آپ نے، ہمیں جس موڑ پر جناب
ہم پر کھلی وہیں سے ہر اک دگر جناب

چہرے سے خود ہی جھلنے کا اندر کا آدمی
پہلے ملائیے گا نظر سے نظر جناب

پی پی کے اشک ایک سمندر بنا ہے دل
کیا ٹھیرے اس کے آگے کوئی چشم تر جناب

شاید میں اس کے خواب میں آیا تو جاگ اٹھا
ورنہ ابھی تو دور بہت ہے سحر جناب

کچھ اور ہم پہ نقد و نظر کی نظر پڑے
کچھ اور رنگ لائیں یہ اپنے ہنر جناب

شاغل کا نام اچھاں کے کیا پائے گا کوئی
شاغل ہے نیک نام، بڑا نامور جناب





بیکار میرے دوست روایات کو نہ چاٹ
دنیا بدل گئی ہے چل اب تو بھی اور باٹ

روتا ہے تھلے ہاتھ کوئی نامراد جاٹ
فصلوں کو شب ہی شب میں کوئی لے گیا ہے کاٹ

سورج کو اپنے سر پہ لئے کھومتے ہیں ہم
اب ظلمتوں کی کھائی کو ہم لوگ دیں گے پاٹ

اجباب جب کہ ہو گئے ماضی پرست سب
چلتے گا ہم بھی آج پہن لیں پرانا ٹاٹ

بہتی ندی یہ اس کی پیاسوں کا ہے، مجھ
خشکی میں اس سے دور ہیں خود اسکے اپنے پاٹ

شعری سفر میں کیا ہوا شاغل نہ پوچھئے
صفت گری کی دھن میں غزل ہو گئی سپاٹ





ہر سمت مجھ کو پانی کا سایا دکھائی دے
عالم تمام کھرا ہی کھرا دکھائی دے

اپنا نیت کی کاش یہ معراج پاؤں میں
ہرا جتنی میں اپنا ہی چہرہ دکھائی دے

آنکھوں کے آگے دکھ کا سمندر تو ہے سدا
یارب! کبھی تو سکھ کا جزیرہ دکھائی دے

دل تشنہ، ہونٹ خشک، امیدیں ہیں ریت
یہ زلیست ہم کو دوست و صحرا دکھائی دے

شاغل ادیب وقت کا شکوہ فضول ہے
جب سایہ اپنا آج پرایا دکھائی دے





کون کس کے درد میں ہوتا ہے شامل آج کل
ہیں سبھی کے سامنے صد ہا مسائل آج کل

صد نثار اُس موڑ کے جس موڑ پر ہم آ گئے
اب ہمارے سامنے ہے راہ منزل۔ آج کل

دشمنوں کا ذکر بے جا وقت کا شکوہ فضول
آدمی ہے آپ اپنا خود ہی قاتل آج کل

زندگی میں ہر وہ پُر تپ سے گزرے ہیں ہم
کوئی بھی مشکل نہیں ہے ہم کو مشکل آج کل

شاعری تو بکھڑ ہے میں خوب پھر کیا بات ہے
محفلوں میں کم نظر آتے ہیں شاغل آج کل





جسم خالی ہے، جان ہے خالی
زندگی کا مکان ہے خالی

تارے امید کے نہیں کوئی
آس کا آسمان ہے خالی

پیاس ناکام لوٹ آئی ہے
مے کی اک اک دکان ہے خالی

دل پڑا رو رہا ہے کھائی میں
عشرتوں کی چٹان ہے خالی

بولتا میں بھی ہوں، کہا کس نے
میر ہی اپنی زبان ہے خالی

کون دے گا دلا سائے شاغل
پیار تنہا، جہان ہے خالی





بجھ گیا ہے دلوں کا ہر احساس
ہو گئی ختم ذلیست کی بوباس

بستیوں میں نہیں گزرا اس کا
جنگلوں میں بھٹکا نہ رہا ہے اس

دل شکستہ ، دماغ ناکارہ
ہے مالِ وفاء ہی اب پاس

وقت سب پر ہی ہیرا بن ہوا
وقت آیا نہ لبس ہمیں کوہِ راس

رام آئے نہ اب نظر کوئی
اب کیا جائے گا کسے بن پاس

پی گئے یوں تو ہم سمتِ در بھی
شاغلِ اپنی بھی نہ لیکن پیاس





برگد کی گھنی چھاؤں نہ زلفوں کی گھٹا ہے
 ہر شخص کڑی دھوپ کے حیر میں کھڑا ہے
 ساکت سا کسی کو نے میں افسوس پڑا ہے
 شاید کہ وہ میری ہی طرح ٹوٹ چکا ہے
 محتاط بہت رہتا ہے عیسیٰ نفسوں سے
 ہر کام یہاں جال صلیبوں کا بچھا ہے
 دو شخصوں کے بیچ آج یہ دیوار ہے کیسی
 اُس پار کھڑا کوئی یہی سوچ رہا ہے
 اس شہر میں سب اپنی پرستش کے ہیں خواہاں
 اس شہر انا کا تو ہر اک ذرہ خدا ہے
 جینے کی دعاؤں کا مزا پا تو چپکے ہیں
 درکار فقط اب ہمیں مرنے کی دعا ہے
 یہ محبتِ حبابیؑ نے سکھایا مجھے شاغل
 ”ہے وہ ہی سخنور بڑا انساں جو بڑا ہے“





اندھیری کھائی سے باہر مجھے نکال گیا
وہ ایک لمحہ مری زندگی اچھا لگ گیا

سدا متھ ہی جھولی میں کوئی ڈال گیا
ذیر وجود پہ جب بھی مرا سوال گیا

گہرنا چاہا تھا خود کو ملی نہ خالی سیپ
وہ نامراد سمندر سمجھ کھٹکا لگ گیا

وہ ایک شخص جو تھا میری راہ کی دیوار
وہ ایک شخص مجھے بار بار سنبھال گیا

یہ سچ ہے اپنی انا سے نہ بچ سکے لیکن
رفیقو! زہر تمہارا بھی پائسٹال گیا

تمام رات رہی سر پہ دھوپ ہی شاغل
مرے وجود پہ سورج یہ کون اچھا لگ گیا





میں ریگ زارِ وقت میں بھٹکا کیا بہت
 ذروں کے ساتھ ساتھ بکھرتا رہا بہت

پاگل اُسے کہیے کہ اوتا کر ستن کا
 کیوں اپنے سائے کو وہ پکڑتا رہا بہت

ہوں آگ یا ہوں پانی، ہوا ہوں یا خاک ہوں
 مجھ کو مرے وجود نے الجھا دیا بہت

گو مر گیا تھا اپنے جہنم ہی پہ میں مگر
 بیکار اجل نے مرا پیچھا کیا بہت

کیا پوچھتے ہو یاروں کے اس شہر کا سلوک
 شاغلِ ساموم دل بھی یاں تھرا گیا بہت





حیاتِ مثلِ گہر ہے، اچھا ل کر دیکھو
سمندروں کو غموں کے کھنگال کر دیکھو

کرم سے اس کے بھرے گا جواب کا شکل
مگر ہے شرطِ ذرا تم سوال کر دیکھو

کھلے گا تم پہ کہ جیتے جی مرنا ہے کیا شے
مرا جو حال ہے وہ اپنا حال کر دیکھو

خلوص اور بھی نیت کا جھمکائے گا
تمام نیکیاں دریا میں ڈال کر دیکھو

میں گے ٹوٹ کے مجھ سے اجالے دیکھو گے
مجھے گچھاؤں سے باہر نکال کر دیکھو

ہے شیشے سا بڑا نازک ہمارا دل شاغل
کہیں یہ ٹوٹ نہ جائے، اچھا ل کر دیکھو





کرب و احساس کے ساغر کو جگایا جائے
ساخہ مجھ کو نیا کوئی پلایا... جائے

جھانکو مجھ میں کہ ہوں جذبات کا بہتالاوا
مجھ کو پتھر کی طرح یوں نہ بُتایا جائے

شہر کا شہر ہے بہرِ پھرے راہ بہ راہ
میرے چہرے پہ بھی اک چہرہ لگایا جائے

سب کے آنکھن سے گزارے گا اجالا سورج
پہلے تفریق کی دیوار کو ڈھایا جائے

وقت کے ساتھ تو بہتے رہے صدیوں شغل
کیوں نہ اب وقت کو ساتھ اپنے بہلایا جائے





ہم ٹھہری ہوئی جھیل میں پھینکا کئے پتھر
یا گنتے رہے بس یوں ہی حالات کے چکر

ہر شخص ہے اس دور میں راون کی طرح تو
ہے کون جو کہلائے محبت کا سیمبر

شیشہ گھروں کی یارو حفاظت ہے ضروری
دیوانہ زمانہ ہے لئے ہاتھ میں پتھر

اکثر مرے دل میں رہی زخموں کی بہاریں
سینے میں مرے پھول کھلے ان ہی سے اکثر

شاغل جی وہاں پر بھی چلے آئیں گے احباب
تم لاکھ رہو دور کہیں بستی سے جا کر





جن کے چہرے سے سکوں یار و عیال ہوتا ہے
ان کے سینے میں مگر دردِ نہاں ہوتا ہے

صبح کھا جاتی ہے اور شام نکلتی ہے انہیں
وقت کے مارواں کو سکھ چین کہاں ہوتا ہے

ہم کہہ پی جاتے ہیں اٹے ہوئے آنسو اپنے
دورِ دل ہم سے کہاں کھل کے بیاں ہوتا ہے

کوئی ہم دردِ غریبوں کا نہیں دنیا میں
بے کسوں کا تو خدا ہی نگراں ہوتا ہے

یہ حقیقت ہے عبارت ہے وفا ہم سے مگر
بے وفائی کا انہیں پھر بھی گماں ہوتا ہے

دل کے جلنے سے نہ کیوں لب پہ کراہیں آئیں
شمع جلتی ہے تو محفل میں دھواں ہوتا ہے

بے قصور آج بھی سولی پہ ہیں لٹکے شاغل
”آج کے دور میں انصاف کہاں ہوتا ہے“





جمالِ حسن و ریحِ فن رہا ہے آنکھوں میں
سدا یہ وقت کا درپن رہا ہے آنکھوں میں

مثالِ شمع جلا گام گام دل اپنا
ہر ایک راستہ روشن رہا ہے آنکھوں میں

سدا جلاتے رہے درد کے الاؤ ^۳ ہمیشہ
مرا وجود کہ کن دن رہا ہے آنکھوں میں

نہ کب سروں پہ اڑے کرب کے گھٹنے بادل
نہ کب بلاؤں کا ساون رہا ہے آنکھوں میں

میں بھول جاؤں بھی دشمن کو کیسے ارے شاغل
ہمیشہ وہ مرا دشمن رہا ہے آنکھوں میں





غم وفا کی راہ کا، اس دل میں کیا رکھتا ہوں میں
 ہر غم دنیا کی منزل کا پستہ رکھتا ہوں میں
 اشک کے انجم، غموں کے چاند، زخموں کے چراغ
 ان سے اپنا آج گھر آنگن سجا رکھتا ہوں میں
 شب چٹھے روتا ہوں تاریکی میں شب بزم سا مگر
 دن نکلتے پھول سا چہرہ کھلا رکھتا ہوں میں
 ہے خبر اے گردشِ دوراں تجھے کچھ آج بھی
 دل میں روشن تیرے داغوں کا دیا رکھتا ہوں میں
 ہوں عجب دیوانہ میں بھی ^{دوستی} دوستی کے شہر کا
 دشمنوں کے واسطے نقدِ وفا رکھتا ہوں میں
 میں کہ ہر اک دور کے مقتل میں مارا ہی گیا
 لوگ کہتے ہیں ”مجھے غم کیا خدا رکھتا ہوں میں“
 ہے یقین شاغل مجھے پاؤں گا میں دادِ ہنس
 ہر کسی کے آگے فن کا آئینہ رکھتا ہوں میں





دعا مانگی ہے اپنا ہم نوا سنسار ہو جائے
بہت ممکن ہے سارا شہر اپنا یار ہو جائے

دعا کرنا کہ میں سارے جہاں کے کام آ جاؤں
دعا کرنا مسیحا سب کا یہ بیمار ہو جائے

پنچھا اور ہوگی انساں تجھ پہ رفعت سار عالم کی
اگر اونچا تری گفتار کا معیار ہو جائے

جنوں میرا نہ مجھ تک ہی رہے محدود اے یارو
جنوں میرا یہ دشمن کے گلے کا رہا ہو جائے

خلوص ذات ہے اس میں نہ شاغل جذبہ و ہمت
تو کیسے کامراں پھر آج کا فتکار ہو جائے



اشکوں کا ہلاہل

اے کاش تجھے ڈھنگ سے جینا آتا
 ہر زخم کو ہنستے ہوئے سینا آتا
 مل جاتا ہر اک گھونٹ پر امرت کا مزہ
 اشکوں کا ہلاہل تجھے پینا آتا

شاعلیٰ ادیب



سینے میں اک ہلکی سی جھین باقی ہے
 اک آس کی دھندلی سی کرن باقی ہے
 اے دوست تیرے اپنے تغافل پر بھی
 وہ سوزِ محبت وہ لگن باقی ہے



ہر درد ہے اب دل کا ابھرنے والا
 ہر زخم ہے سینے کا نکھرنے والا
 ہر سمیت دیئے غم کے جلائیں آؤ
 انساں کا مقدر رہے سنورنے والا



ہر درد میں اک لطف نیا پاتا ہوں
 ہر غم پہ غزل ایک نئی گاتا ہوں
 اے درد و غم یارِ تصدق تیرے
 دنیا کے ہر اک غم سے گزر جاتا ہوں





پاوت





دنیا نے ہمیں یارو ستایا ہے بہت
 سینے پہ سدا زخم لگایا ہے بہت
 ہے اپنی ہستی سے اسے اک نفرتِ خاص
 کم بخت نے ہر لمحہ رلایا ہے بہت



ہر درد پہ اوروں کے مچل جاتا ہوں
 ہر غم کے دلابے پہ بہل جاتا ہوں
 بھڑکاتا ہے اپنوں کا سدا جھکوسلوک
 یہ میری شرافت ہے سنبھل جاتا ہوں



اے رفعتِ تہذیب تجھے دیکھ لیا
 اے اوجِ تمدن تجھے ہم نے پرکھا
 ہے یہ بھی اک اندازِ ترقی شاید
 انساں ہی کی نظروں سے ہے انسان گرا



قومی یکجہتی

پھولوں کی طرح رہنا ہے سب کو کھیل کے
ٹوٹیں نہ کبھی دوستو رشتے دل کے
اس دیس کی ایکائی "پہ آئے نہ کبھی آ پنج
جینا ہے یہاں مل کے ہے مزاج مل کے

قرآن کا سبق سب کو پڑھانا ہے ہمیں
گیتا کے پامٹھ سب کو سنانا ہے ہمیں
دینا ہے ہمیں آشتی کا سندلیہ
ہر بھارتی کو "ایکائی" سکھانا ہے ہمیں

مسلم ہو کہ ہندو ہو کہ سکھ عیسائی
سب کی ہے اسی بات میں اب اچھائی
لے ڈوبے گی یہ فرقہ پرستی سب کو
تھام کر و مل جل کے یہاں "ایکائی"

ہر ذرہ ہمارے نظر آتا ہے مجھے
ہر قطرہ بھی گنگا نظر آتا ہے مجھے
قربان ترے دیدہ قدر و عظمت
ہر قطرہ بھی تو ہمیں نظر آتا ہے مجھے

نذرِ محبت

شہنشاہِ رباعی حضرت امجدِ حسین امجد کی وفات پر



اب فلسفہ زلیست کا پیغام گیا
 صہبائے تصوف کا بھرا جام گیا
 ہے شورِ بیاہر سودِ کن میں "ہم ہے"
 اک سعدیؒ اردو گیا ختم گیا

وہ حاصلِ رنگین بیانی نہ... رہا
 فنکارِ ادب، غمیرتِ مامی نہ رہا
 لے لے وائے! گیا شاہِ رباعی امجد
 افسوس کہ ایسا سرِ مدِ ثانی نہ رہا

وہ شاعر و سرتاجِ سخن ہم میں نہیں
 وہ شعلہ نوا، صاحبِ فن ہم میں نہیں
 تھی دھوم بڑی شعر و ادب میں جس کی
 لے لے وائے! وہ عندلیبِ دکن ہم میں نہیں



نیا سازِ نیا نغمہ

چھڑ سازِ نو ، نیا نغمہ سنا
 گلا نئی دھن اور نئی تانیں اڑا
 سینہ بزمِ کہن میں بھر اترج
 اور دیارِ فن پہ اک جدت کھلا

شاغلِ ادیب



قطعات





ہوں نیا انسان مری باتیں نئی
 دن نئے میرے ، مری راتیں نئی
 ہر سحر میرے لئے پیغامِ نو
 شامِ ہر ، لاتی ہے سوغاتیں نئی

تیرہ دھن کو درخشاں کر تولوں
 روحِ افسردہ کو تاباں کر تولوں
 پھونک ڈالوں ظلمتِ خلوتِ ندیم
 بجھتی ہستی میں چراغِ افساں کر تولوں

نغمہ شوق گارہا ہوں میں ،
 غنچہ دل کھلا رہا ہوں میں
 بزمِ میں ہے بپا قیامت اک
 آگِ جبل میں لگا رہا ہوں میں

یہ ترا حسن نازنین محبوب
 نرم و نازک کلی سے ملتا ہے
 تو کہ مرمر کا اک صہنم گویا
 تجھ کو ہر لمحہ میں نے پوچھا ہے





ہے قیامت ہر سحر میرے لئے
اور پیغام اجل ہر شام ہے
فرصتِ غم ایک لمحہ بھی نہیں
زندگانی کیا اسی کا نام ہے

صبح جیتے ہیں شام مرتے ہیں
یوں بسر زندگانی کرتے ہیں
کون سمجھے گا یہ کہ روز و شب
کیسے شاغل کے اب گزرتے ہیں

زندگی جیسے ایک سحر ہے
درد کی دھوپ میں جلے ہے آس
ہے مقدر ہر آدمی کا یہی
ریت کھالینا اور پینا پیاس

چھاؤں کوئی ، کوئی آنچل بھی نہیں
کوئی سایہ کوئی گیسو بھی نہیں
دھوپ میں بھٹکے کوئی کب تک بتا
زیست بن باس ہے اور تو بھی نہیں



قطعات اردو

تاریخی، تہذیبی قومی اور سانی نظریات کے زیر اثر

ہے یہ اردو زبان اگر اپنی
اپنی تہذیب کی ہے گر پونجی
آؤ اس کی بقا کا عہد کریں
ہے اگرچہ یہ ورثہ قومی

بولی اردو نہیں ہے پردیسی
ہے جنم بھومی اس کی بھارت ہی
اصل اس کی اگر سمجھتی ہے
شاعری دیکھئے گا خسرو کی

نکتے سمجھائے اس نے قرآن کے
گائے گیتا کے پاٹھ بھی اس نے
آشتی کا پیام ہے اردو
اس نے جینا سکھایا "ایکے سے"

ہر طرف اس کی ہے سیلی صدا
ہے کھڑی بولی کا یہ راگ نیا
نغمگی اس کی پوچھتے کیا ہو
میٹھے سرو والی ہے برج بھاشا

قطعاتِ عمید

سینے میں سو چراغ جل اٹھتے
آج گرتیری دید ہو جاتی
گیت ہونٹوں پہ سو چل اٹھتے
گر وطن میں یہ عمید ہو جاتی

ہم کو جام سکوں پلانہ سکی
درد و غم ہائے دل بھلانہ سکی
اے کہ پھڑی ہو مجھ سے تم جب سے
آج تک میری عمید آنہ سکی

ہونٹ جم جاتے ہیں، ہنسی کیا ہے
سانس رکھتی ہے زندگی کیا ہے
اے مری غم نواز تو ہی بستا
عمید کیا چہیز ہے، خوشی کیا ہے

اے خلش! ٹھہر دم زرا لوں میں
ہم نواؤں کی یاد آتی ہے
عمید ہے خوش ہیں سب مگر جاتے
چشم میری کیوں خوں بہاتی ہے

